ہندوستان کی جنگ آزادی کے

۱۷۵۷ — ۱۹۴۷

مسلمان مجاہدین

1757 — 1947

مجاہد جنگ آزادی

یوارام گپت

سب کہاں؟ کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ہندوستان کی
جنگِ آزادی
کے مسلمان مجاہدین!

۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء

وطن ہمیشہ رہے شاد کام اور آزاد
ہمارا کیا ہے، اگر ہم رہے رہے نہ رہے

اے ہم وطن مسلمانو
اپنے شہیدوں کو پہچانو

میواڑام گپت ستوریا

منسوب کر وم

ہندوستان کی جنگِ آزادی کے مسلمان مجاہدین

"سنہ ۱۸۵۷ء لغایت سنہ ۱۹۴۷ء"

اُن تمام مسلمان مجاہدینِ آزادی، اور آزادی کی راہ میں قربان ہونے والے شہیدوں کے نام، جو اس کتاب میں شامل ہیں اور اُن کے نام جو گمنام ہیں یا جن کے بارے میں مجھے معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

تمام مسلمان مجاہدوں، اور شہیدوں کو سلام اور ان کے دائمی سکون کے لئے دُعاگو

میوارام گپتؔ ستوریا

اطلاعات

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی

مصنف :- شری میوارام گپت ستوریا (مجاہدِ جنگِ آزادی)

تاریخ اشاعت :- دسمبر ۱۹۸۸ء

تعداد اشاعت :- ایک ہزار (بار اول)

قیمت :- ۳۵ روپئے

اہتمام اشاعت، کتابت، تزئین، آفسٹ اور پروسیسنگ } ستار پبلشنگ ہاؤس، ۱۷۵-۱ اے مولانا شاہ روڈ بمبئی ۴۰۰۰۲۷

پرنٹر :- ایم عالم

طباعت :- بھارت لیتھو اینڈ آفسٹ ورکس، بمبئی ۳ (زیر اہتمام :- ستار پبلشنگ ہاؤس بمبئی ۳)

پبلشر :- ادارہ شہیدانِ وطن پرکاشن

ملنے کے پتے

بمبئی میں :- معرفت راجندر پرتاپ گپت ۳/۴ بی انڈین ایرماسٹر کالونی کالینہ بمبئی ۴۰۰۰۲۹

کانپور میں :- چھوٹے لال گپت ۲۱۶/۱۰ خلاصی لائن کانپور (اتر پردیش)

نگاہ! آنکھوں سے اِس خاکِ پاک کو جس کو شہیدوں نے لالہ زار کیا (میوارام گپت)

پیش لفظ

ہندوستان کی جنگ آزادی کم وبیش دو صدیوں پر محیط ہے۔اس طویل عرصے میں ملک کے مختلف فرقوں اور طبقوں کے افراد نے اپنے جان و مال کی قربانیاں دے کر تحریکِ آزادی کی شمع کو روشن رکھا لیکن یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ آزاد ہندوستان کے باشندے آج شمعِ آزادی کے اُن پروانوں کو نہ صرف یہ کہ فراموش کر چکے ہیں بلکہ اپنے عمل و کردار سے ملک کی آزادی کو بھی خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ ملک کے شہیدوں نے اپنا خون صرف اس لئے بہایا تھا کہ مستقبل کی نسلیں امن و شانتی اور عزت و وقار کے ساتھ زندگی بسر کریں لیکن آزادی کے چالیس سال گزرنے کے بعد تباہی و بربادی، نفرت و انتشار اور ظلم و بربریت کا اثر زیادہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ شاید شہیدوں کی روحیں ہماری حالت دیکھ کر بے چین ہو رہی ہوں گی۔

اخبارات و اعلانات کے ذریعے بار بار چند ایسے پروگراموں اور تجاویز کا اعلان ہوتا رہتا ہے جن کے ذریعے ملک کو متحد رکھا جا سکے اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان یکانگت و مفاہمت کا جذبہ قائم رہ سکے، کسی نے کیا دل لگتی بات کہی ہے کہ جو قوم اپنے ماضی کو فراموش کر دیتی ہے، اپنا حال نہیں سنوار سکتی اور ہمارے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوا اگر ہمارے نوجوان اور نونہالوں کو جنگ آزادی کی تاریخ سے آشنا کرا جائے اور شہیدانِ وطن کے خون کی قدر و قیمت کا احساس دلا جائے۔

قابلِ مبارک باد ہیں عالی جناب میو ارام گپت صاحب جنھوں نے اُن شہیدانِ وطن کی زندگی اور کارناموں کا احاطہ کیا ہے جنکا تعلق ایک اقلیتی طبقے یعنی مسلمانوں سے ہے ہندو مسلم فسادات ہمارے ملک کی ایک ایسی لعنت ہے جو ملک کی جڑیں کھود رہی ہے انگریزوں

کے دور میں ہندو مسلم نفاق کا ذمہ دار غیر ملکیوں کو قرار دیا جاتا تھا لیکن آزادی کے بعد کیسے قصور وار گردانا جائے؟

یہ فسادات غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا نتیجہ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ گپت صاحب کی اس کتاب کو پڑھ کر کوئی بھی صاحب فہم ہندوستانی فسادات کی مذمت ہی کرے گا۔ کیونکہ اسے اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ ملک کی آزادی کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں نے اپنا خون بہایا ہے۔

زیر نظر کتاب کے پہلے باب میں گیارہ مجاہدین آزادی کا تذکرہ ہے۔ اس میں گپت صاحب نے ۱۸۵۷ء سے تحریک آزادی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو گپت صاحب نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ بقیہ ابواب مسلم شہیدوں اور مجاہدوں کی حالات اور ان کی آزادی کے لئے تگ و دو کو جانفشانی کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔

گپت صاحب خود جنگ آزادی کے ایک سپاہی رہ چکے ہیں اور یہ ان کی موجودہ فضا سے بے اطمینانی اور بے چینی کا نتیجہ ہی ہے کہ وہ بڑے موثر انداز میں ماضی کو کریدتے ہیں۔ سلیس اور رواں انداز میں لکھے ہوئے شہیدوں کے یہ خاکے محض تحریریں نہیں ہیں بلکہ ہماری تاریخ کے روشن باب ہیں۔ خدا کرے گپت صاحب کی یہ کوشش کامیاب ہو اور اہل وطن اس تاریخ کی روشنی میں اپنی روش کو بدل لیں تاکہ ایک متحد، خوشحال اور ترقی یافتہ ہندوستان وجود میں آسکے۔

یکم فروری سنہ ۱۹۸۸ء

آدم شیخ

نوٹ:۔ جناب آدم شیخ، برہانی کالج آف کامرس اینڈ آرٹس میں اردو شعبہ کے ہیڈ پروفیسر ہیں اور اردو ایجوکیشن بورڈ کے چیرمین بھی ہیں اس "پیش لفظ" کے لئے میں ان کا ممنون و مشکور ہوں۔

بھولارام گپت مستوریا۔

مصنف کی بات

ہندوستان کی "جنگ آزادی" کب شروع ہوئی تھی۔ اس کی کوئی مخصوص تاریخ تو نہیں بتلائی جاسکتی مگر یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہماری جنگ آزادی اسی دن شروع ہوگئی تھی۔ جس دن گورے انگریزوں کے کالے اور ناپاک ارادوں کا پتہ وطن پرست آزادی کے شہیدوں کو چل گیا تھا۔

ہندوستانی تہذیب کے مطابق ہم نے انہیں اپنا مہمان سمجھ کر ان کی خاطر و مدارت کی تھی اور ہندوستان کی مقدس سرزمین پر انہیں بودو باش کا موقع فراہم کیا تھا۔ لیکن کسے خبر تھی کہ ان تن کے اجلوں کا من کالا ہے۔

ہماری انگلی پکڑنے کے بعد انہوں نے ہمارا پہونچا پکڑ لیا اور اس کے بعد ہماری گردن ہی دبوچ لی۔ جسے ہم دو صد سال کے بعد ہی چھڑا سکے۔

تاجر بن کے آنے والے انگریز رفتہ رفتہ اس ملک کے مالک بن بیٹھے اور ہماری جان و مال، حتیٰ کہ دین و ایمان کی بھی تجارت کرنے لگے۔ ہندوستان کی دو عظیم قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو مدت دراز سے شیر و شکر بن کر رہ رہی تھیں۔ ان کے باہمی میل ملاپ اور اتحاد کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے نفاق کے بیج بوئے۔ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول کی بناء ڈالی۔ اس ضمن میں وقتی طور پر ان کو کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ اور اس خیال سے کہ ان کی گرفت مضبوط رہے۔ انہوں نے ہندوستانیوں کے آپسی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لئے تاریخ کے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا تاکہ ہندوستان کو نسل کے ذہنوں میں آپسی بھائی چارے کی جگہ "نفرت" کے بیج کو بویا جاسکے اور اس طرح ان کا راج مستحکم ہوسکے لیکن

محب وطن ہندوستانیوں نے ان کی تمام تر کوششوں کو مسلسل آزادی کی تحریک سے ناکام بنایا۔ جان و مال کی قربانیاں دیں۔ سروں پر لاٹھیوں اور سینے پر گولیوں کی بارڈھ روکی۔

جس دیس کو دنیا "سونے کی چڑیا" کہتی تھی اسے غاصب انگریز آسانی سے چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ اپنی حکومت کو اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے انہوں نے اس ملک کے باشندوں پر اس قدر ظلم کئے کہ اس ملک کی سرزمین آزادی کے متوالوں کے خون سے سرخ ہو گئی اور یہ سرخ لہو ہندو مسلمانوں کا مشترکہ لہو تھا جو صرف مادرِ وطن کی آزادی کے لئے بہا اور جس نے انگریزی راج کی بنیادوں کو ہلا دیا۔

سنہ ۱۹۴۲ء کی۔ "انگریزو بھارت چھوڑو" کی انقلابی تحریک اور آزاد ہند فوج کی "دلی چلو" کی تحریک کے علاوہ سنہ ۱۹۴۶ء میں "نیوی کے انقلابی بغاوت نے ان کے رہے سہے اوسان خطا کر دیئے۔ انگریز، عالمی جنگ جیت کر بھی اس قابل نہ رہے کہ وہ ہندوستان پر مزید راج کر سکیں اور آخر کار آزادی کے لئے پھانسی پر جھول جانے والے، توپ سے اڑا دیئے جانے والے اور اس سرزمین کو اپنے سرخ لہو سے لالہ زار بنانے والے ہندوستانی شہیدوں کی قربانیاں رنگ لائیں اور اس ملک پر آزادی کا پرچم لہرایا۔

میں، یہاں انتہائی انکساری سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ میں نے وطن کی آزادی کے لئے قربان ہو جانے والے لاکھوں کروڑوں ہندوستانیوں کے سچے تاریخی واقعات کو جمع کرنے کے لئے عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کیا۔ میں خود بھی مجاہدِ آزادی ہوں اور ان مرحلوں سے واقف ہوں۔ جس سے گذر کر ہم نے یہ آزادی حاصل کی ہے، اور میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مسلمان مجاہدین آزادی کی تاریخ مرتب کروں تاکہ آج کی نسل

اور آنے والی نسلوں کو یہ علم ہو سکے کہ اس ملک کی آزادی کے لئے خون بہانے والوں میں مسلمان مجاہدین بھی برابر کے شریک تھے۔ میں نے کسی خاص قوم کی خوشی یا ناخوشی سے پرے ہٹ کر سچے تاریخی واقعات پر مبنی کرداروں کو پیش کیا ہے۔

جنگِ آزادی کے مسلمان مجاہدین پر مسلمانوں نے کم اور ہندوؤں نے زیادہ لکھا ہے۔ خود میں نے کئی کتابیں لکھی ہیں اور اردو میں بھی لکھی ہیں، کیونکہ اردو زبان کو میں اپنی زبان سمجھتا ہوں اور میرا اندازہ ہے کہ مسلمان نوجوان اپنی قوم کے شہیدوں کے نام تک سے ناواقف ہیں۔ کسی فلمی ستارے کے بارے میں وہ جس تفصیل سے بتلا سکتے ہیں کسی شہیدِ وطن اور آزادی کی راہ میں جان دینے والے مسلمان مجاہد کے بارے میں ان کی معلومات صفر ہیں۔

اس بحث کی ضرورت نہیں کہ یہ غلطی کس کی ہے؟ آج ضرورت ہے کہ ان کو اور اس دیش میں رہنے والوں کو بتایا جا سکے کہ وہ کون مسلمان مجاہدین تھے جنہوں نے اس ملک کی آزادی کے لئے اپنا خون بہایا، شہید ہوئے۔ اس فرض کو پورا کرنے میں، میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں۔ آپ کی رائے سے مجھے معلوم ہو سکے گا۔ ویسے میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری تلاش میں کافی نام رہ گئے ہیں اور میرے لکھنے میں بھی کچھ کمی ہو سکتی ہے اس کے لئے مجھے درگذر فرمایا جائے تمام شہیدانِ آزادی پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہوئے اور ان کو سلام کرتے ہوئے میں صرف یہ چاہوں گا کہ گھر گھر ان شہیدوں کے گن گائے جائیں اور ملک کا بچہ بچہ ان سے متعارف ہو سکے تاکہ نفرتوں کے وہ اندھیرے ذہنوں سے دور ہو سکیں جو انگریزی راج کے دین تھے اور ہمارا ملک قومی یکجہتی بھائی چارے، میل ملاپ تمام مذاہب کے احترام اور پیار سے آگے بڑھ سکے۔ ترقی کر سکے اور وہ خواب پورے ہوں جو شہیدوں نے دیکھے تھے۔

میوارام گپت ستوریا

جنگِ آزادی کا آغاز

جنگ آزادی کی تاریخ لکھنے والوں کی اس رائے سے میں اتفاق کرتا ہوں کہ اصل میں ہماری آزادی کی لڑائی کا آغاز ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ سے ہوا تھا۔ بنگال کے نواب علی وردی خاں کا ۱۰ اپریل ۱۷۵۶ء میں انتقال ہوگیا تھا ان کی جگہ پر ان کے ناتی مرزا محمد عرف سراج الدولہ گدی نشین ہوئے۔ ان کے اس ناتی کی عمر صرف ۲۰ سال تھی۔ اس کی عمر بھی کچی تھی، اور اسے حکومت کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ درباری ہندو اور مسلمان سردار سب اس نوعمر نواب کو اپنے اپنے اثر میں رکھنا چاہتے تھے اور فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ سلطنت مغلیہ کا اقتدار ختم ہو چکا تھا، اور یہ بنگال کا نواب خودمختار ہو چکا تھا۔ دور دراز کے علاقوں پر اگر دلی کی کوئی حکومت بھی تھی تو برائے نام تھی۔

۲۱ مئی ۱۷۵۶ء کو یوروپ میں فرانس اور انگلینڈ کے درمیان لڑائی چھڑ گئی تھی، اس لئے اس وقت ہندوستان میں جو فرانس اور انگلینڈ کے لوگ تھے۔ ان میں بھی لڑائی چھڑ گئی فرانس اور انگلینڈ کی تجارتی کمپنیاں اپنے اپنے مفاد کے لئے ہندوستانی راجاؤں نوابوں اور بڑے بڑے زمینداروں سے مدد لیا کرتی تھیں۔ وہ ان سے مدد لیتی بھی تھیں اور انہیں ان کی باہمی لڑائیوں میں مدد بھی دیتی تھیں۔ یہ دونوں قوم کے لوگ ہندوستان

پر اپنا اپنا قبضہ جمانے کی فکر میں تھیں۔ لیکن بالآخر فرانسیسیوں پر انگریز غالب آئے اور پھر انہوں نے ہاتھ پیر پھیلانا شروع کر دیا انگریز نو عمر نا تجربہ کار نواب شجاع الدولہ کی کمزوریوں اور ان کے دربار میں چل رہے آپسی داؤں پیچوں سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے حسب عادت اس کا خوب فائدہ اٹھایا۔ رشوت، دھوکا، چالاکی اور مکاری سے انہوں نے کام لیا، اور اپنی طاقت خوب بڑھالی۔ انہوں نے قلعہ بندی اور ہتھیار جمع کرنا شروع کر دیا۔

بنگال کا حاکم نواب سراج الدولہ تھا۔ اور انگریز یہ سب کام اس کی اجازت کے بغیر کر رہے تھے۔ اس لیے نواب کو بہت برا لگا۔ نواب نے انگریزوں کی قاسم بازار کی فیکٹری پر قبضہ کر لیا اور قلعہ بندی کو روک دیا۔ نواب نے ۲۰ جون ۱۷۵۶ء کو فورٹ ولیم پر قبضہ کر لیا۔ اس سے انگریز بہت ناخوش ہو گئے ایسٹ انڈیا کمپنی کا جنرل ڈائریکٹر اس وقت لارڈ کلایو تھا۔ جو بہت چالاک اور کمپنی کا خیر خواہ تھا۔ اس نے اپنی فوجی طاقت بھی بڑھالی، اور نواب سراج الدولہ کے ایک جنرل میر جعفر کو بھی اپنی طرف ملا لیا۔ کلایو نے میر جعفر کو یہ لالچ دیا کہ وہ ان کو بنگال کا نواب بنا دے گا۔ غدار جنرل میر جعفر کی مدد اور رشوہ پا کر کلایو نے نواب پر حملہ کر دیا۔

پلاسی کی لڑائی

پلاسی کے میدان میں کلایو اور نواب سراج الدولہ کی فوجوں کا ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو آمنا سامنا ہوا۔ اور بہت خوفناک جنگ لڑی گئی۔ نواب کی فوج میں ہندو بھی تھے۔ مسلمان بھی تھے۔ کئی ہزار سپاہی قتل ہو گئے۔ ان میں کتنے ہندو تھے اور

کتنے مسلمان تھے یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ ہاں! یہ بتانا آسان ہے کہ پلاسی کی لڑائی میں دیش کی آزادی کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل جل کر خون بہایا تھا، اور خون سے سُرخ ہوئی لڑائی کی زمین یہ بتانے سے قاصر تھی کہ اس آزادی کے لئے کس نے کتنا خون بہایا۔

شہید میر مدن

اس لڑائی میں جنرل میر مدن نے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا تھا، اور دشمن کی توپ کے گولے سے زخمی ہو کر شہادت پائی تھی۔ نام سے ہی نہیں وہ شہادت پانے میں بھی میر تھے۔ میر جعفر اپنی غداری میں میر تھے۔ میر مدن اپنی وفاداری میں میر تھے۔ ایک کی عقیدت سے تو دوسرے کو حقارت سے یاد کیا جاتا ہے۔ میر جعفر کی غداری کی وجہ سے نواب سراج الدولہ پلاسی کی جنگ ہار گئے، اور کل بنگال پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہیں سے ہندوستان میں انگریزی حکومت کی بنیاد پڑی۔

شہید سراجُ الدّولہ

میر جعفر کی غداری خود میر جعفر کو لے ڈوبی تھی۔ اس نے ۲ جولائی ۱۷۵۷ء کو اپنے نواب سراج الدولہ کا قتل کروا دیا تاکہ وہ خود نواب بنا دیا جائے۔ وہ نواب بھی بنا مگر کتنے دنوں کے لئے؟ میر جعفر تو کلایو کے ہاتھوں میں کھلونے کی طرح تھا اور ان کے اشاروں پر کام کرتا تھا۔ بنگال میں دیکھا جائے تو نوابی تو اس کی ہی تھی، یعنی لارڈ کلایو کی۔

شہید میر قاسم

غدار میر جعفر کو اس کی غداری کا انعام یہ ملا کہ اس کی ہی فوج اس کی باغی ہو گئی اور جنرل میر قاسم اب خود بنگال کا نواب ہو گیا۔ وہ ۲۷ستمبر ۱۷۶۰ء سے ۱۷ جولائی ۱۷۶۳ء تک ہی بنگال کا نواب رہا۔ وہ بڑا بہادر تھا اور انگریزوں کی چالاکیوں سے واقف تھا۔ انگریز اسے بھی اپنے اثر میں لانا چاہتے تھے۔ اس نے انگریزوں کے ہتھیار چھین لئے اور انہیں سلطنت کو بغیر ٹیکس دیئے تجارت کرنے کی اجازت نہ دی۔ جب انگریزوں نے بہت شور و غل مچایا تو اس نے سب کے لئے چنگی معاف کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں اور نواب کے درمیان ۱۹ جولائی ۱۷۶۳ء کو لڑائی چھڑ گئی۔ مگر نواب میر قاسم بکسر کی لڑائی میں، جو ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو لڑی گئی تھی۔ بری طرح سے ہار گیا، اور شہید ہو گیا۔ نواب میر قاسم کے ساتھ اور کتنے مسلمانوں نے شہادت دی۔ وہ معلوم نہیں۔

پٹنہ کے نامعلوم باغی سپاہیوں کی شہادت

پٹنہ میں مقیم ہندوستانی فوج نے مئی ۱۷۶۴ء میں بغاوت کر دی۔ ان کی مانگ تنخواہ بڑھانے کی تھی۔ ان باغیوں میں ہندو بھی تھے۔ اور مسلمان بھی تھے۔ ان باغیوں کو پکڑا گیا اور انہیں پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ بہتوں کو توپ کے منہ پر باندھ کر اڑا دیا گیا تھا۔ وہ نامعلوم مسلمان شہید تھے۔

شہید یوسف خاں

بنگال کی فوج نے بھی ۳ ستمبر ۱۷۶۵ء کو بغاوت کر دی تھی۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ لوگ تاملک (مدنا پور) جا کر جہاز پر سوار ہو جائیں۔ انگریز انہیں ملک کے باہر ڈچ لوگوں سے لڑنے کے لئے لے جانا چاہتے تھے۔ سپاہیوں نے ملک سے باہر جا کر کٹنے اور مرنے سے صاف انکار کر دیا۔ انہیں باغی سپاہیوں میں یوسف خاں بھی تھا۔ اسے باغی سپاہیوں کا سرغنہ سمجھا گیا اور اسے توپ کے منہ پر باندھ کر اڑا دیا گیا۔

فقیروں کی شہادت

بنگال میں ۱۷۶۲ء سے ۱۷۷۳ء تک مسلمان فقیروں اور ہندو سنیاسیوں کی بغاوت ہوئی تھی۔ تاریخ میں اس بغاوت کو "سنیاسی ودروہ" کا نام دیا گیا ہے۔ مگر ان باغیوں میں مسلمان فقیر بھی کافی تعداد میں تھے۔ یہ لوگ سرکار کی کوئی بات نہیں سنتے تھے، اور اپنے کو آزاد سمجھتے تھے۔ وہ تو خدا کے بندے تھے جس کی وہ بندگی کرتے تھے۔ انگریزوں کی بندگی سے انہیں صاف انکار تھا۔ ہسٹنگ (Hasting) انہیں ہندوستانی جپسی کہتا تھا۔

ان باغی فقیروں کا شمال میں کابل سے لے کر چین کی سرحد تک ایک طرح سے قبضہ تھا۔ ان فقیروں نے ڈھاکہ کی انگریز فیکٹری پر ۱۷۶۳ء میں قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۷۶۸ء میں سارن

ضلع بہار میں انگریزی فوج کے ساتھ ان کا تصادم ہو گیا۔ وہ انگریزوں کے لئے سر درد ہو گئے۔ انگریزی فوج کے ساتھ اِن فقیروں کی کئی بار لڑائیاں ہوئیں اور ان میں سے بہت سے شہید ہوئے۔ وہ بھی انگریزوں کو نہیں چاہتے تھے۔

شہید حیدر علی

حیدر علی جو کہ میسور کا سلطان تھا۔ ایک بہادر سپاہی بھی تھا۔ وہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے اور ان کے ناپاک ارادوں سے واقف ہو چکا تھا۔ اس نے انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خود اپنی ریاست کے لئے خطرہ محسوس کیا۔ اس نے ۱۱ر جون سنہ ۱۷۶۰ء کو آرکاٹ کے جنوب تیاگار کے مقام پر انگریزوں کی فوجی طاقت کا مقابلہ کیا۔ ۳۱ر اکتوبر سنہ ۱۷۶۰ء کو حیدر نے آرکاٹ پر قبضہ کر لیا۔ انگریزوں کے جہازی بیڑے نے حیدر علی کے جہازی بیڑے پر، کالیکٹ اور منگلور کے ساحلوں پر اکتوبر سنہ ۱۷۸۱ء میں حملہ کر کے انہیں تباہ کر دیا۔ حیدر علی نے یکم جولائی ۱۷۸۱ء کو پورٹونووو میں انگریزوں کی مضبوط فوج پر حملہ کر دیا، اور شکست فاش پائی۔ وہ اب آرکاٹ چلا گیا۔ مگر انگریزی فوج نے اس کو آرکاٹ میں جا گھیرا۔ وہ بہت بہادری سے لڑا۔ اور انگریزی فوجوں کو بھگا دیا۔ حیدر علی کی ہمت کو داد دینا چاہیئے۔

مئی سنہ ۱۷۸۲ء میں حیدر علی نے پرما کوئل کو اور ۲ر جون سنہ ۱۷۸۲ء کو برٹش جنرل کو ہرا کر فتح پائی۔ لیکن لڑتے لڑتے اب وہ تھک گیا تھا۔ ۷ر دسمبر سنہ ۱۷۸۲ء کو چتور کے کیمپ میں اسے اسی وقت

آرام ملا جب اس نے اپنی جان شیریں اپنے پروردگار کو سپرد کر دی۔

شہید ٹیپو سلطان

ٹیپو سلطان ۱۷۶۳ء میں پیدا ہوا تھا۔ وہ بہادر باپ کا بہادر بیٹا تھا۔ انگریزوں کو ملک بدر کرنے میں اس نے بھی شہادت پائی تھی۔ ٹیپو سلطان کو میسور کا شیر کہا جاتا تھا۔ اس نے انگریزوں کے ساتھ کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ لڑتے لڑتے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو شہید ہو گیا۔ اپنا نام وطن پرستوں میں لکھا کر امر ہو گیا۔ ٹیپو کی شہادت سے انگریز بہت خوش ہوئے تھے۔ جب اس کی موت کی خبر برٹش کمانڈر جنرل ہیرس کے پاس پہنچی تو اس نے راحت کی سانس لی اور کہا:

"اب کل ہندوستان ہمارا ہے"

وہ ایسا کیوں نہ کہتا۔ کیوں کہ ٹیپو سلطان نے تو اس کا ناطقہ بند کر رکھا تھا، اور اس کی دال نہیں گلتی تھی۔

انگریزوں کو ملک سے بھگانے کے لئے ٹیپو سلطان نے بہت کوششیں کیں ... یہاں تک کہ اس نے فرانسیسیوں تک سے مدد لی تھی۔ اس نے کئی ملکوں کو اپنے سفیر بھیجے لیکن اس کی مدد کے لئے کوئی نہ آیا۔ نظام اور مرہٹہ اس وقت ٹیپو کا ساتھ نہ دے کر انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ اور پھر خود اس کی فوج میں میر جعفر موجود تھے۔

وائسرائے لارڈ ویلزلی۔ کو جب معلوم ہوا کہ ٹیپو سلطان دوسری ریاستوں سے کابل، قسطنطنیہ، موریشس، درسلز وغیرہ سے امداد حاصل کرنے جا رہا ہے تو اس نے زبردست آخری حملے کی تیاری کر دی۔ یکم ستمبر ۱۷۹۸ء میں اس نے

نظام حیدر آباد سے صلح کرلی۔ مرہٹوں کو اس نے لوٹ کا سامان دینے کا وعدہ کرلیا۔ اتنی بڑی طاقت اپنے ساتھ لے کر اس نے ٹیپو سلطان پر چڑھائی کر دی۔ پھر بھی شیر دل ٹیپو سلطان دو مہینے تک فوج کے چھکے چھڑاتا رہا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے اس کی دارالحکومت سری رنگپٹنم کو لوٹا اور اسے برباد کر دیا۔ ہزاروں مسلمانوں اور ہندوؤں کو گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔ ٹیپو سلطان کی عظیم شہادت کے ساتھ دکن کی ریاست بھی شہید ہوگئی۔

شیر دل ٹیپو سلطان فخر ہندوستان زندہ باد

پلاسی کی لڑائی کے بعد کا ہندوستان

پلاسی کی لڑائی نے ہندوستانیوں کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اور جیسے انہیں خواب سے بیدار کر دیا تھا۔ اب ان کی سمجھ میں اچھی طرح سے یہ بات آگئی تھی کہ ان کے گورے مہمانوں کے ارادے کیا ہیں؟ لیکن بسم اللہ غلط ہو جانے سے نتیجہ غلط ہو جاتا ہے ..... یا یہ کہ جب پانی سر سے گزر جاتا ہے تو ہاتھ پاؤں مارنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ٹھیک اسی طرح غلامی کا پانی ہندوستانیوں کے سر سے گزر چکا تھا۔ وہ طوفانی سیلاب میں بہہ گئے، اور بہتے بہتے ساحل سے بہت دور نکل گئے۔ کنارے آکر لگے تو سیلاب ہی ختم ہو گیا تھا۔

ہندوستان کے زمینداروں، راجاؤں، اور نوابوں میں یہ کمی دیکھی گئی تھی کہ انہوں نے مل کر کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کی آپسی پھوٹ ہی انہیں لے ڈوبی تھی۔

انگریزوں کو قریب قریب ہر مورچے پر فتح حاصل ہوتی تھی۔ کیونکہ ان کے فوجیوں کو لڑائی کی اچھی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کے پاس اچھی قسم کے اسلحے بھی ہوتے تھے۔

ہندوستان غلام اس لئے بنا کیونکہ یہاں کے راجاؤں میں تعاون کی بہت کمی تھی۔ وہ اکثر باہمی لڑائیوں میں ہی الجھے رہتے تھے اور اپنے حریف کو زیر کرنے کے لئے ملک دشمن انگریزوں سے مدد لیا کرتے تھے۔ چالاک اور مکار انگریزوں کو کسی ملک کو غلام بنا کر رکھنے کے حربے خوب آتے تھے۔ مثلاً انہوں نے ہمارے ملک کی دستکاری کو پہلے تباہ کیا، تاکہ یہاں کے کاریگر اور دستکار ہمیشہ ان کے محتاج بنے رہیں۔ ڈھاکہ کی ململ جو دنیا بھر میں مشہور تھی اور جو امیروں کے بدن کو زینت بخشتی تھی۔ اس ململ کے بننے والے مسلمان جولاہوں کے انگوٹھے کٹوا دیئے تھے۔ ڈھاکہ کی خوبصورت اور نفیس ململ کو مسلمان جولاہے ہی تیار کرتے تھے۔ (انہیں تو زندہ شہید کہنا چاہیئے) تاکہ وہ اپنے ملک کا مشینی کپڑا یہاں آرام سے فروخت کر سکیں۔ انہوں نے تو یہاں کی تجارت کو ہی ختم کر دیا تھا اور ہندوستانی بازاروں کو ولایتی مال سے پاٹ رہے تھے۔ کچا سامان جیسے کپاس یا روئی وہ یہاں سے لے جاتے تھے۔ اور اس سے کپڑا ولایت میں تیار کراتے تھے۔ ہندوستان میں لاکر کئی گنا زیادہ قیمت وصول کرتے تھے۔ اس کے علاوہ جو کام انہوں نے کیا وہ یہاں کی مدت سے بسی قوموں کو لڑانے کا کیا۔ راجاؤں اور نوابوں کو بھی آپس میں لڑانے کا کیا۔ اپنی تہذیب اور اپنی زبان تک ہم پر لاد دی تاکہ ہم سدا ان کے ہی گیت گاتے رہیں۔ اور اگر کبھی خدا کے فضل و کرم سے ہم جسمانی طور سے آزاد بھی ہو جائیں تب بھی ذہنی طور پر ان کے غلام بنے

رہیں، دیکھا جائے تو ہم ذہنی طور پر آج بھی انگریزوں کے غلام ہیں۔ لیکن اس غلامی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم آزاد نہیں ہیں۔ جس قوم نے ہمارے اوپر صدیوں حکومت کی ہو اس کے اثرات سے محفوظ رہنا بھلا ممکن ہی کب تھا۔ خیر یہ سب باتیں بحث طلب ہیں۔

کاش صدیوں کی غلامی کے بعد ہر ہندوستانی کے ذہن میں یہ بات ذہن نشین ہونا ہی چاہیے کہ وہ مستقبل میں ایسی کوئی غلطی نہ کریں جس کی بناء پر غلامی کے دن دیکھنا پڑیں۔ غلامی تو وہ بدترین شے ہے جسے چرند پرند تک پسند نہیں کرتے ہیں۔ البتہ مجبوری کی بات دوسری ہے۔ لیکن جب میں ہندوستان کی دو عظیم قوموں ہندو اور مسلم میں جہالت کے آثار دیکھتا ہوں تو دل لرز جاتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ ہمیں پھر کبھی کسی بیرونی قوم کا غلام بننا پڑے۔ شہید وطن اشفاق اللہ خاں نے اپنی شہادت کے پہلے قوم کو اپنا آخری پیغام دیتے ہوئے کہا تھا:۔

"ہندوستان میں رہنے والے ہندو اور مسلمان اگر چاہیں کہ وہ ایک دوسرے کو ختم کر دیں تو یہ ناممکن ہے۔ وہ چاہیں کہ ہم پیار و محبت سے رہیں اور اپنے ملک کی ترقی کے لئے کچھ کریں تو یہ بالکل ممکن ہے۔ ہمارے ملک کو ہندو سبھا اور مسلم لیگ کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت ہے عالمی ہندو اور مسلم اتحاد کی..... اور ایسے لوگوں کی جو دونوں قوموں کو محبت اور تعاون کا درس پڑھا سکیں"

۱۸۵۷ء کا غدر اور قتلِ عام

۱۷۵۷ء کی پلاسی کی جنگ کے بعد سے صاف طور پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ انگریز حکمراں کے جنگی ناپاک ارادے کیا ہیں؟ ان کے ان ارادوں کو معلوم کرکے ہندوستان کے راجے۔ نواب وغیرہ اپنی حکومتوں کے تحفظ کے لئے ۱۸۵۷ء تک انگریزوں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرتے رہے تھے لیکن وہ متحد ہو کر کبھی ان سے نہیں لڑے تھے۔ پھر بھی انہوں نے انقلاب کی آگ کو بجھنے نہیں دیا تھا۔ متحد ہو کر تو وہ صرف ۱۸۵۷ء میں ہی انگریزوں کے خلاف میدانِ جنگ میں اترے تھے۔ اسی لئے اس جنگ کو ۱۸۵۷ء کا غدر نہ کہہ کر اسے ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کا نام دیا گیا ہے۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کلی طرح سے اور دل سے ہم اس وقت بھی ایک نہیں ہو سکے تھے۔ اس وقت بھی ہمارے منہ میں رام اور بغل میں چھری دبی ہوئی تھی۔ وطن میں بہت سے میر جعفر اور جے چند زندہ تھے۔ گورکھا اور سکھ سپاہیوں کی گولیوں کے ہم شکار ہو رہے تھے۔ مٹھی بھر انگریزوں کو ہم ملک سے باہر نہ بھگا سکے۔ کیونکہ ان کے پاس گورکھوں اور سکھوں کی ایک بڑی فوج تھی۔ ہمیں تو ہمارے بھائیوں ہی نے آزاد نہیں ہونے دیا تھا۔ اگر کہیں مسلمانوں کی طرح سکھوں نے بھی وطن کے انقلابیوں کا ساتھ دیا ہوتا تو ہندوستان ۱۸۵۷ء میں ہی آزاد ہو گیا ہوتا۔ اس پر بھی اب آنسو بہانا بے سود ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے جنگِ آزادی کے ہار جانے کے اور بھی کئی وجوہ تھے۔ جن زمینداروں۔ راجاؤں اور نوابوں کی اپنی حکومتیں چھن

جانے کا خوف تھا۔ ان میں باہمی اتفاق کی کمی تھی۔ ان کے پاس جو فوج تھی وہ لڑائی کے حربوں سے واقف نہیں تھی۔ ان کے پاس جو ہتھیار تھے وہ پرانی قسم کے تھے۔ انہیں سب وجوہات سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکامیاب رہی۔

ہماری بغاوت کا ظالم انگریزوں نے ہمیں جو صلہ دیا اس کی چند مثالیں ہی کافی ہوں گی۔

(۱) ہزاروں باغی ہندوؤں اور مسلمانوں کی درختوں سے لٹکا کر پھانسی دی گئی تھی۔ درختوں پر لٹکا کر نیچے آگ جلا کر انہیں بھونا گیا تھا۔

(۲) ایک قطار میں کھڑا کر کے باغیوں پر گولیاں چلائی گئی تھیں

(۳) باغیوں کو توپ کے دہانے پر باندھ کر انہیں توپ داغ کر بارود اور گولوں سے اڑایا گیا تھا۔

(۴) ایک ہی مکان میں بند کر کے باغیوں کو مکان میں آگ لگا کر بھونا گیا تھا۔

(۵) گھوڑوں کی ٹاپوں کے تلے بھی گھوڑوں کو دوڑا کر باغیوں کو کچلا گیا تھا۔

(۶) خواتین کی بے حرمتی کی گئی تھی

(۷) ہندو اور مسلمان مجاہدین جنگ آزادی کی جائیدادیں ضبط کر لی گئی تھیں۔

(۸) کسی پر کوئی مقدمہ نہیں چلتا تھا۔ صرف صاحب کا حکم ہی چلتا تھا۔ انگریز صاحب کا حکم ہی حکم خدا تھا۔

(۹) جو وطن کے غدار تھے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو ناکامیاب بنانے میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ انہیں انگریزوں نے بڑے انعامات اور جائیدادیں دے کر نوازا بھی تھا۔

(۱۰) وطن دشمنوں کو ہی "رائے صاحب" اور "خان بہادر" کی بڑی بڑی ڈگریاں تقسیم کی گئی تھیں۔ ان کے گلوں میں یہ ڈگریاں غلامی کے تمغے تھے جو انہوں نے اپنے ہم وطنوں کا خون بہاکر حاصل کئے تھے۔

شہید والی خاں

شہید والی داد خاں عُرف والی خاں صاحب وَلد رحیم خاں، مجاہد جنگ آزادی جناب محمد وراثت علی خاں صاحب راعت کوٹی کیابی (ضلع ہلاس پور۔ مدھیہ پردیش) کی والدہ صاحبہ کے حقیقی نانا تھے۔ وہ بمقام قصبہ کوڑے ضلع فتح پور میں ۱۸۲۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ کل چار بھائی تھے۔ کوئی لڑکا نہیں تھا۔ ابتدائی عمر میں وہ ورزش کرتے تھے اور چند مشہور پہلوانوں کو زیر کر چکے تھے۔ موصوف ۱۸۵۷ء کے پہلے دیسی رجمنٹ نمبر ۱۱ کے میرٹھ کے افسر اعلیٰ تھے جب کارتوسوں میں سؤر کی چربی کا قصہ پیدا ہوا تو انہوں نے انگریزی افسر کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ کارتوس داخل اسٹور کر دیئے جائیں۔ ایک انگریز افسر نے ان کو بُرا بھلا کہا۔ اس پر آپ نے اس پر فائر کر دیا اور جھگڑا شروع ہو گیا جو کہ غدر کے نام سے موسوم ہے۔ جب والی صاحب کو خبر ملی، کہ انگریزوں نے دہلی پر دھاوا بول دیا ہے۔ تو یہ پوری رجمنٹ لے کر دہلی پہنچے۔ انہوں نے بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے ملاقات کی۔ یہ اپنی صورت شکل میں بادشاہ سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ گویا وہ بادشاہ کے ہمشکل تھے۔ انہوں

نے بادشاہ سے ان کا لباس۔ تاج۔ اور شاہی گھوڑا حاصل کیا۔ جب وہ میدانِ کارزار میں پہنچے تو عام شہرت ہوگئی کہ بادشاہ سلامت خود فوج کی قیادت کر رہے ہیں۔ فوج کے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھ گیا۔ والی صاحب نے اس شدت سے حملہ کیا کہ انگریزی فوج بھاگ نکلی۔

دوسرے دن پھر اسی طرح کا ہنگامہ برپا ہوا اور انگریزوں کو پھر شکست فاش ہوئی۔ تیسرے دن میدان کارزار میں جانے سے قبل انھوں نے اپنے سالے اکرم خاں کو بتایا کہ

"آج ۱۷ مئی ۱۸۵۷ء میری شہادت کا دن ہے۔ تم میرے ساتھ ہی رہنا۔ جب میں زخم خوردہ ہوجاؤں تو تم میرے گھوڑے پر میرے پیچھے بیٹھ جانا۔ اور گھوڑے کی ایڑ لگانا۔ وہ بھاگ کر قلعہ میں داخل ہو جائے گا۔ وہیں مجھے دفن کر دینا"

آپ نے جو کچھ فرمایا تھا ویسا ہی ہوا۔ آپ کی نعش قلعہ دہلی کے میدان میں دفن کر دی گئی۔ لباس، تاج، اور گھوڑا بادشاہ کے حوالے کر دیا گیا۔ والی خاں صاحب کا نام برٹش گورنمنٹ کے ریکارڈ میں بانیٔ غدر (۱۸۵۷ء) کی حیثیت سے درج ہے۔

کہتے ہیں آپ کے پانچ عزیزوں نے بھی والیسی پر اٹاوہ میں جام شہادت نوش کیا تھا۔ اکرم خاں جو ولی خاں کے سالے تھے اور آخر دم تک ساتھ رہے تھے۔

ان بے شمار مسلمانوں کا قتل

جن پر تاریخ کبھی روشنی نہ ڈال سکی ہے اور نہ ڈال سکے گی۔ ان مجاہدین کا قتل ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ انہوں نے ہی ۱۸۵۷ء کی جنگ کے لئے زمین ہموار کی تھی۔ اپنے خون سے "جنگِ آزادی" کی داغ بیل ڈالی تھی اور وہ اس کی بنیاد کے پتھر بنے تھے۔ عام طور پر لوگ کسی محل کے کنگوروں کو ہی دیکھتے ہیں وہ زمین دوز پتھروں کو نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کی قسمت میں گمنام مرنا لکھا تھا وہ اپنا فرض پورا کر گئے۔ خواہ آپ انہیں کبھی یاد کریں یا نہ کریں۔ کاش! ہم بھی اپنا قومی اور سیاسی فرض سمجھتے۔

جب سے ہندوستانی وطن پرست عوام کو انگریزوں کے ناپاک ارادوں کا پتہ چلا تو وہ سکون کی نیند سو نہ سکے۔ ہندوستان کے سینکڑوں وطن دوست افراد نے اپنے اپنے ڈھنگ سے ملک و قوم کے دشمن انگریزوں سے لڑ کر اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔ اگر وہ راجہ یا نواب وغیرہ تھے تو ان کی افواج نے ان کے لیے اپنی جانیں قربان کی تھیں اور شہید ہوئے تھے۔ کہاں ہے ذکر ان کا..... کیسے کیسے جانباز، نڈر، بے باک، بے خوف شہداء ہیں ہماری تاریخ میں۔ قیاس کرکے، ذرا شمار تو کیجئے۔

۱۷۷۰ء اور ۱۷۷۹ء میں انگریزوں کے ساتھ مختلف قبیلوں کی لڑائیاں۔ ۱۷۸۳ء میں خاصی قبیلے کی لڑائی۔ ۱۷۹۸ء میں کنجم قبیلے کی لڑائی۔ ۱۸۰۳ء میں نائر بانین کی لڑائی۔ اس کے بعد ۱۸۳۸ء۔ ۱۸۰۴ء فریدی تحریک۔ ۱۸۰۸ء میں،

ٹراون کور کے دیوان کے ساتھ انگریزوں کی لڑائی۔ ۱۸۰۹ء میں جاٹوں کی لڑائی۔ ۱۸۱۳ء میں سہارن پور کے گوجروں کی لڑائی۔ ۱۸۱۸ء میں خاندیش کے بھیلوں کی لڑائی۔ ۱۸۲۴ء میں بندیل کھنڈ قبیلے کی لڑائی۔ ۱۸۲۴ء میں ہی "کتور اسیکاؤں" کی تحریک ۳۲-۱۸۳۱ء میں کولیوں کی لڑائی۔ ۱۸۳۲ء کے مان بھوم کے بھوم جی سے لڑائی۔ ۱۷۹۴ء، ۱۸۳۴ء تک وجیا نگرم کے سرداروں کے ساتھ لڑائیاں۔ ۱۸۳۹ء میں ناگاؤں سے لڑائی۔ ۱۸۴۴ء میں کولہاپور میں لڑائی ۱۸۴۶ء میں اڑیسہ کے کھونڈسوں کے ساتھ لڑائی۔ ۱۸۵۵ء میں سنتھالوں کی لڑائیاں اور ۱۸۵۷ء میں منڈا قبیلے والوں سے لڑائی اور ۱۸۵۷ء کے بعد بھی ان لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا تھا۔

۱۷۶۷ء، ۱۷۷۴ء دھل بھوم کے راجا کے ساتھ — ۱۸۰۲ء میں بیلری ضلع کے پولیگروں کے ساتھ۔ ۱۷۹۴ء وجے نگرم کے راجہ کے ساتھ۔ ۱۸۳۹ء آسام اور ۱۸۴۴ء میں بریلی (اتر پردیش) کے تعلقہ داروں کے ساتھ۔ ان لڑائیوں میں کتنے مسلمان مجاہد تھے۔ اسے کون بتا سکتا ہے۔؟

شہید مولوی احمد اللہ شاہ

مولوی احمد اللہ شاہ فیض آباد (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔ آپ نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ وہ بغاوت کے علم برداروں میں تھے۔ انہوں نے اپنے گھر کو اپنے عیش و آرام کو محض اس لئے چھوڑ دیا تھا، کہ انہیں اس ظالم انگریزی سرکار کا خاتمہ کرنا تھا۔ جنہوں نے اودھ کی ریاست کو یہ کہہ کر اپنے قبضے میں کر لیا تھا کہ اودھ کا

انتظام خراب ہے، اور رعایا بہت تکلیف میں ہے۔ یہ تو ان کا ایک بہانہ تھا۔ انگریزوں کی اس بہانہ بازی نے وطن پرست مولوی احمد شاہ کو تڑپا دیا تھا۔ اپنے دل میں اسی تڑپ کو لے کر انہوں نے قریب قریب کل ملک کا دورہ کیا اور لوگوں کے دلوں کو حب الوطنی کے بے لوث جذبات سے گرما دیا۔ انقلاب کا نعرہ بلند کرنے کے لئے آمادہ کیا۔

شہید تیتو میر عرف تیتو میاں

تیتو میر جنہیں لوگ تیتو میاں کہہ کر پکارتے تھے۔ بہار صوبہ کے مشہور پہلوان تھے۔ اپنے علاقے میں ان کا بڑا اثر تھا۔ انگریزی حکومت کے وہ دشمن تھے، اور انگریزوں کو دشمن قوم سمجھتے تھے۔

یہ زمانہ تھا ۱۸۳۲ء کا۔ جب کلکتہ کے مشرق میں ۲۴۔ پرگنہ۔ ضلع ندیا اور ضلع فرید پور کے گرد و پیش میں تیتو میاں کا ہی طوطی بولتا تھا۔ انگریزوں کو ملک بدر کرنے کے لئے انہوں نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ ہمت تو اس شہید وطن کی دیکھئے کہ اکیلے ہی نکل پڑے انگریزی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے جبکہ آپ کسی علاقہ کے نہ راجہ تھے اور نہ نواب تھے۔ ان کا عقیدہ شاید تھا.... ”ہمت مرداں، مدد خدا“

لیکن یہ بھی کہنا پڑے گا کہ انگریز بھی تو ہمت والے تھے جو سات سمندر پار کر کے ملک میں حکومت کرنے آئے تھے جو ان کی زبان تک نہیں سمجھتے تھے۔ خدا نے ان کی بھی مدد کی تھی۔ خیر تیتو میاں نے انگریزوں کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کبھی ہمت شکن نہیں ہوئے۔ شکست کھاتے اور شکست بھی دیتے رہے۔ آخر کار ملک کی آن کے لئے شہید ہو گئے۔

غدر کے شہید مسلمان

کل ہندوستان میں ایک ہی دن یعنی ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو غدر کر دینے کی تاریخ مقرر کی گئی تھی لیکن کچھ خاص وجوہات کی بناء پر میرٹھ چھاؤنی کی پلٹنوں نے ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو ہی غدر شروع کر دیا تھا۔ جب غدر شروع ہی ہو گیا تو دیگر مقامات کی فوجوں نے بھی مقررہ تاریخ سے قبل کہیں بعد میں بہر حال غدر شروع کر دیا۔

تمام باغیوں نے دہلی کے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اپنا سپہ سالار بنایا۔ کیوں کہ ان تمام باغیوں کا کوئی سردار ہونا بھی ضروری تھا۔

بہادر شاہ ظفر صرف برائے نام بادشاہ تھے انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اور بادشاہ کے تمام شاہی اختیارات ختم کر دیئے گئے تھے۔ تاہم باغیوں نے ان کو ہی اپنا کمانڈر ان چیف مانا تھا۔ سب باغی پروگرام کے مطابق دہلی میں جمع ہونے لگے تھے۔

بعد میں ان باغیوں نے ان کی حکومت پھر قائم کرا دی تھی اور انھوں نے باغی افواج کی کمان بھی سنبھال لی تھی۔

ان باغی فوجیوں میں مسلمان بھی کثیر تعداد میں تھے جنہوں نے اپنے پیارے وطن کے لئے گمنام شہادت دی تھی۔ تاریخ میں ان کی تعداد ندارد ہے۔

مفصلہ ذیل فوجوں نے بغاوت کی اور وہ دہلی، بادشاہ ظفر کے پاس گئی تھیں

نمبر شمار	کہاں سے گئی تھیں	دہلی پہنچنے کی تاریخ	رجمنٹ کا نام	پیدل یا گھوڑ سوار	توپ خانہ	دیگر کیفیت
۱	میرٹھ	۱۱ مئی ۱۸۵۷ء	تیسری	دو پیدل ۱۱ویں ۲۰ویں	×	سب سے پہلے پہنچی
۲	دہلی	,,	۳۸، ۵۴ اور ۷۴	۳ پیدل	۶ توپیں	—
۳	جھانسی	۶ جون ۱۸۵۷ء	چوتھی ملی جُلی	ایک پیدل ۱۲ سپاہی	—	—
۴	متھرا	۵ جون ۱۸۵۷ء	۴۴ویں	۵۰۰ سوار	—	—
۵	لکھنؤ	۳۰ جون ۱۸۵۷ء	ملی جُلی	۵۰۰ پیدل ۵۰۰ سوار	—	—
۶	نصیرآباد	۱۹ جون ۱۸۵۷ء	گوالیار اور مالوا کی پلٹنیں	۵۰۰ سوار	۶ توپیں	—
۷	جالندھر	۲۲ جون ۱۸۵۷ء	لائٹ انفنٹری	۲۸۰ پیدل	۱ توپ	—
۸	فیروزپور	۲۴ جون ۱۸۵۷ء	۴۵، ۵۷	۱۰۰ پیدل	—	بغیر ہتھیار
۹	بریلی	۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء	ملے جُلے	پیدل	۶ توپیں	۲۵ ہاتھی ۳۰۰ بیل گاڑیاں اونٹ پالکیاں
۱۰	جھانسی	۴ اور ۵ جولائی ۱۸۵۷ء	۱۴ویں	سوار اور پیدل	۳ توپیں	دو ہاتھی

۱۱	گوالیار	۲ جون ۱۸۵۷ء	گوالیار پلٹن	۴۰۰ سوار	—	—
۱۲	نیمچ	۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء	۷، ۵۷	بنگال کے سوا ۴م پیدل گوالیار اور کوٹہ	۹ توپیں ۱۰ ہاتھی	—
۱۳	بنارس	۱۶ اگست ۱۸۵۷ء	لدھیانہ کی سکھ فوج	۳۰۰ پیدل ۲۰۰ سوار	—	—
۱۴	علی گڈھ	۱۲ جون ۱۸۵۷ء	—	ایک پیدل فوج	—	—
۱۵	آگرہ	۱۲ جون ۱۸۵۷ء	—	دو پیدل فوجیں	—	بغیر اسلحہ —
۱۶	روہتک	۱۴ جون ۱۸۵۷ء	—	ایک رجمنٹ پیدل	—	—
۱۷	جھجر	۱۸ مئی ۱۸۵۷ء	—	۳۰۰ سوار	—	—
۱۸	بادشاہ کے ذریعہ بھرتی	۱۳ جون ۱۸۵۷ء	—	۴۰۰ سوار ۱۶۰۰ پیدل	—	—
۱۹	امراؤ بہادر دودے خاں کے لڑکے	۷ اگست ۱۸۵۷ء	—	۴۰ سوار ۱۰۰۰ پیدل	—	—
۲۰	الہ آباد	۲۷ جون ۱۸۵۷ء	۱۶ ویں	۱۰۰ سوار	—	—

نوٹ :- بہت سے نام چھوٹ گئے ہیں۔ کل تعداد اس طرح ہے :-
۳۰ توپیں تھیں ۴۰۰۰ سوار تھے اور ۱۲۰۰۰ پیدل تھے۔
۱۰۰ سوار اور ۳۰۰۰ پیدل ایسے بھی تھے جو آزاد تھے۔
ان سب پیدل اور سواروں میں کتنے لوگ شہید ہوئے
اس کا کوئی حساب نہیں ہے لیکن ان میں کافی مسلمان تھے۔

آخریِ مغل بادشاہ کی شہادت

بہادر شاہ ظفر مغلیہ حکومت کا آخری بادشاہ تھا۔ نیک، رحم دل، شاعر اور انسان دوست جو ہندوؤں، اور مسلمانوں کو اپنی دو آنکھیں بتایا کرتا تھا۔ گئوکشی کے خلاف اس نے سخت احکام جاری کئے تھے۔ اس لئے ہندو بھی اسے دل سے اپنا بادشاہ تصور کرتے تھے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے لئے بادشاہ قطعی تیار نہیں تھا۔ اور قبل از وقت تو اس کے تیار ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ لیکن جب میرٹھ کی چھاؤنی میں ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو ہی بغاوت ہو گئی اور اسے سن کر جب دہلی میں فوج نے بغاوت کر دی اور جوق در جوق بہادر شاہ ظفر زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے دہلی پہونچنے لگے۔ ان کو یقین دلایا کہ وہی اب بھی دلی کے بادشاہ ہیں اور وہ سب ان کی کمان میں آزادی جنگ لڑنا چاہتے ہیں اور فتحیاب ہونے کا یقین کامل رکھتے ہیں تو لامحالہ ان کو باغی فوج کی کمان سنبھالنا پڑی تھی۔ جب انھوں نے سپہ سالاری قبول کرلی تو انھوں نے بھی اپنی جان کی بازی لگا دی۔ اپنی رعایا سے ان کو بے حد محبت تھی اور ساتھ ہی ان کو خوفِ خدا بھی تھا۔ ہر مصیبت میں وہ خدا کو یاد کرنا نہ بھولتے تھے۔ خدا کو سجدہ کرتے ہوئے وہ کہتے تھے ؎

"دشمن از ہر طرف ہجوم آورد
یا علی، ولی برائے خدا
فوج غیبی بنہ مددِ بفرست
از تو خواہد ہمیں ظفر بدعا

ضعیفی کے سبب بادشاہ خود تو میدان کارزار میں نہیں جا سکتا تھا۔ مگر لڑائی کی خبروں پر برابر نظر رکھتا تھا۔ فوجیوں کا پیٹ بھرنے کے لئے اس نے شاہی زیورات تک فروخت کر ڈالے تھے اور مقروض تک ہو گیا تھا۔

۷ رستمبر ۱۸۵۷ء کو بادشاہ نے دہلی شہر میں ڈگی پٹوادی کہ
"تمام ہندو اور مسلمان مسلح ہو کر لڑائی کے لئے تیار رہیں"
۱۲ رستمبر کو پھر ڈگی پٹوائی گئی کہ
"بادشاہ سلامت انگریزی فوج پر حملہ کرنے کے لئے خود میدان کارزار میں تشریف لے جائیں گے"
حالانکہ بادشاہ نہیں گئے تھے، اور ان کا لباس اور تاج پہن کر ان کا ہم شکل دوسرا ہی آدمی 'والی خاں گیا تھا، اور باغی پھر جوش میں بھر کر خوب لڑے تھے۔ یہ دوسرا آدمی شہید والی خاں تھا۔

قلعے میں سازش کا دور

بادشاہ نے جس کی پیدائش ۱۷۷۵ء میں ہوئی تھی سن رسیدہ ہو کر زینت محل سے شادی کی تھی۔ اس حسینہ نے بادشاہ ظفر کے دل و دماغ پر کچھ اپنا ایسا سکہ جما رکھا تھا کہ وہ اگر کوئی بات جھوٹ بھی کہہ دیتی تو بادشاہ اسے سچ سمجھ لیتا تھا۔ زینت محل کے دماغ پر حکیم احسن اللہ خاں اور مرزا الہی بخش چھائے ہوئے تھے۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ان دو سازشی

ذہن دیکھنے والوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی۔ وہ بادشاہ کے کان بھرتی رہتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے جواں بخت کو بادشاہ کا ولی عہد بنانا چاہتی تھی، اور دن رات اسی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ وہ خوب اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر اس کا بیٹا تخت نشین نہ ہوا تو بادشاہ کی وفات کے بعد اس کی حالت ابتر ہو جائے گی۔ اسی لئے وہ انگریزوں کے پٹھوؤں کو خوش کرنے میں لگی رہتی تھی۔

مرزا الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ نے بیگم زینت محل کو یہ یقین دلایا تھا کہ آخر میں انگریزوں کو ہی فتح ملے گی۔ اس لئے انگریزوں کو خوش رکھنے میں ہی اس کی بھلائی ہے۔ مرزا الٰہی بخش اپنے داماد فخرالدین کو بادشاہ کا جانشین بنانا چاہتا تھا۔ جب اس کی دفعتہً موت ہو گئی تو مرزا الٰہی بخش نے زینت محل کو ہی اس کی موت کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا، اور اس لئے وہ ہر طرح سے اس سے اور بادشاہ سے بدلہ لے رہا تھا۔ اس نے ہی اسے انگریزوں کا گرویدہ بنا دیا تھا، اور میجر ہڈسن کو اس سے بھاری رشوت بھی دلائی تھی۔ شہزادے سب اپنے عیش و آرام میں مست رہتے تھے۔ وہ بزدل بھی تھے۔

شہزادوں کے بارے میں بادشاہ ظفر کے خیر خواہ مولانا فضل الحق خیر آبادی نے لکھا ہے کہ شہزادوں کو لڑائی کا تجربہ نہ تھا۔ وہ سب عیاش اور نکمے تھے۔ ان کے نکمے پن کا، بزدلی کا اور عیش و آرام کی زندگی جینے کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو گا کہ ان کے ساتھ قریب چھ۔ سات ہزار لوگ تھے۔ ان کے پاس تلواریں اور بندوقیں بھی تھیں۔ وہ ہمایوں کے مقبرے میں محفوظ بھی تھے۔ پھر بھی انہوں نے صرف ایک سو مسلح انگریزوں

کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ پھر بھی انہوں نے صرف اپنے آپ کو بلا شرط ان کے سپرد کر دیا تھا۔ میجر ہڈسن نے بعد کو انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اگر وہ سب مل کر انگریزوں پر حملہ کر دیتے تو انگریز بھاگ کھڑے ہوتے۔

مرزا الٰہی بخش برابر بادشاہ کو سمجھایا کرتا تھا کہ انگریزوں سے صلح کر لینے میں ہی اس کی بھلائی ہے اور اس نے بادشاہ کو انقلابیوں کے ساتھ دہلی سے باہر نہ جانے دیا اور سب کا خاتمہ کرا دیا۔

۱۵ ستمبر ۱۸۵۷ء تک انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور بادشاہ کو قید کر لیا۔ بادشاہ اس وقت لاؤ لشکر کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے میں تھا، اور اس مقبرے کو کل مغلیہ خاندان کا ہی مقبرا بننا تھا۔

غدار مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ کے ہمایوں مقبرے میں پہنچنے کی خبر غدار منشی رجب علی کو دے دی تو اس غدار نے وہ خبر انگریز میجر ہڈسن کو پہونچا دی اور ظالم ہڈسن نے ۲۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بادشاہ کو قید کر لیا۔ بادشاہ کے قید ہو جانے کے بعد اس نے شہزادوں کو بھی گرفتار کر لیا۔

شہزادوں کی شہادت

بادشاہ کو گرفتار کر لینے کے بعد اب ہڈسن نے مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر کو گرفتار کیا۔ یہ سب اتنے بزدل تھے کہ انہوں نے ہڈسن سے صرف اتنا ہی چاہا تھا کہ وہ ان کی جان بخش دے۔ لیکن اس نے کہلایا کہ میں تمہاری جاں بخشی کا کوئی وعدہ نہیں کرتا۔ مگر تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تم اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔ لیکن ملک میں اگر غدر نہ ہو گیا ہوتا

تو انہیں کیوں مرنا پڑتا۔ انہوں نے اپنی قربانیاں وطن کے لیے ہی دی تھیں۔ اس لئے ان کا بھی شمار شہیدوں میں ہوگا۔ اور بادشاہ اور زینت محل کا بھی شمار شہیدوں میں ہونا چاہیے۔ ہڈسن ان شہزادوں کو اپنے ساتھ لے گیا اور خود ہی انہیں قتل کردیا اور ان کی لاشوں کو کوتوالی کے صحن میں پھنکوا دیا جہاں سے دوسرے دن مہتروں نے انہیں ہٹایا تھا۔

بادشاہ ظفر پر بغاوت کا مقدمہ

بادشاہ پر مقدمہ چلانے کے لئے ایک فوجی کمیشن مقرر کیا گیا۔ مقدمہ کی شنوائی ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء سے شروع ہوئی اور ۹ مارچ ۱۸۵۸ء کو ختم ہوئی تھی۔ اس میں بادشاہ وقت کے خلاف بغاوت اور انگریزوں کے قتل کا الزام لگایا گیا۔ یہ مقدمہ اس دیوان خاص میں ہوتا تھا جہاں بیٹھ کر بادشاہ خود کبھی دوسروں کی فریاد سنتا تھا۔ اب اسے یہاں قیدیوں کی طرح لایا جاتا تھا۔ اس مقدمہ میں بادشاہ کے خلاف گواہی دینے کے لئے کچھ ایسے لوگوں کو لایا جاتا تھا جو انگریز چاہتے تھے۔ مقدمہ کیا تھا ایک بنا ہوا منصوبہ تھا۔ بادشاہ نے اپنے دفاع میں وہی سب کہا جو الٰہی بخش اور رجب علی نے اس سے کہلوایا تھا۔ مگر اس بیان کو تسلیم نہیں کیا گیا اور انہیں قصوروار ٹھہرایا گیا۔

بادشاہ کو زینت محل، جواں بخت اور عباس شاہ کے ساتھ برما کے لئے جلاوطن کردیا گیا۔ رنگون (برما) میں ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو ۸۷ سال کی عمر میں بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔

بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ اپنے وطن کے لیے شہید ہوئے لیکن اپنی شاعری میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ مندرجۂ ذیل غزل سے عیاں ہو جائے گا کہ باقی زندگی ان کی کتنی کسمپرسی میں گزری تھی۔

غزل

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے، میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

نہ دوائے دردِ جگر ہوں میں، نہ کسی کی میٹھی نظر ہوں میں
نہ اِدھر ہوں میں، نہ اُدھر ہوں میں، نہ شکیب ہوں نہ قرار ہوں

میں نہیں ہوں نغمۂ جاں فزا، مجھے سن کے کوئی کریگا کیا
....

میرا بخت مجھ سے بچھڑ گیا، میرا رنگ روپ بگڑ گیا
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا، میں اُسی کی فصلِ بہار ہوں

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی شمع لا کے جلائے کیوں
کوئی چار پھول چڑھائے کیوں، کہ میں بیکسی کا مزار ہوں

....

جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں، جو اُجڑ گیا وہ دیار ہوں!

شہید مولانا فضل الحق خیرآبادی

مولانا فضل الحق خیرآبادی میں ۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان کے پیروکار ہندوستان میں ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے والد بھی مولانا صاحب کے شاگرد تھے۔

بادشاہ ظفر ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور انہیں خاص حقوق حاصل تھے۔ محل کی اندرونی سازشوں سے وہ بخوبی واقف تھے۔ بادشاہ کو آگاہ بھی کرتے رہتے تھے۔ بادشاہ کو گمراہی سے بچانے کی کوشش کرتے رہتے تھے، لیکن انقلاب کی لپٹوں نے انہیں بھی جھلس ڈالا تھا۔ انگریزوں نے مولانا صاحب فضل الحق کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔ ان پر بھی بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا تھا۔ انہیں حبس دوام کی سزا دی گئی تھی۔ انڈمان میں ہی جیل کے اندر وہ شہید ہو گئے تھے۔ جیل میں ہی انہوں نے "ثورۃ الہندیہ" نام کی کتاب لکھی تھی۔ انہوں نے یہ مشہور کتاب کاغذ کے ٹکڑوں پر کوئلے سے لکھی تھی اور خفیہ طریقے سے اسے اپنے لڑکے مولانا عبدالحق خیرآبادی کے پاس بھیجی تھی۔ اس کتاب میں غدر کے سچے حالات درج ہیں۔

مولانا عبدالحق نے تمام کاغذی ٹکڑوں کے کئی مسودے تیار کئے جو کہیں کہیں قدیم کتب خانوں میں دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔

شہید محمد حسین

محمد حسین مجھولی (اترپردیش) کا بڑا تعلقہ دار تھا۔ انگریزوں کی نیت کو اور ان کے ناپاک ارادوں کو محمد حسین اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اسے اس وجہ سے انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ ان کے پاس اپنی تھوڑی فوج تھی۔ لیکن لڑائی میں کام آنے والے اچھے اسلحے نہیں تھے اور نہ ہی فوج کو لڑائی کی کوئی تربیت تھی۔ صرف ہمت ہی تھی۔ مگر صرف ہمت سے میدان کارزار میں کام چلتا نہیں ہے۔ ہمت کے ساتھ اچھے اسلحہ کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ آخرکار لڑائی میں وہ بھی کامیاب نہ ہو سکا اور ۲۶ دسمبر ۱۸۵۷ء کو لڑتے ہوئے اس نے شہادت پائی تھی۔

اس بات کو بار بار اور بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انگریزوں کے ساتھ ان گنت لڑائیاں لڑی گئی تھیں، لیکن سب کا ایک ہی حشر ہوتا تھا کیونکہ سب لڑائیوں کے ہارنے کے وجوہ ایک جیسے تھے۔ اگر سبھی زمیندار۔ راجے اور نواب مل کر، پورے اتحاد کے ساتھ، ایک بڑی طاقت بن کر لڑتے ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ ہم غلامی سے جلد نجات پا جاتے۔

افسوس آپسی پھوٹ اور سازشوں نے ہی انگریزوں کے پیر مضبوط کرنے میں مدد دی۔

ضروری نوٹ:۔ مندرجہ ذیل کے حالات "بلٹز ویکلی" بمبئی کے شکریہ کیساتھ۔

۱:۔	لیاقت علی خاں	جولائی ۱۸۵۷ء
۲:۔	احمد یار خاں	۱۸ اپریل ۱۸۵۷ء
۳:۔	نظام علی خاں	۲۶ اپریل ۱۸۵۷ء
۴:۔	حافظ مولوی احمد اللہ شاہ	۹ رجون ۱۸۵۷ء

شہید مولوی لیاقت علی خاں

مولوی لیاقت علی خاں تھے تو مولوی اور ایک اسکول میں پڑھاتے تھے۔ مگر وہ پیدائشی انقلابی تھے اور انگریزوں کی غلامی انہیں ہرگز پسند نہ تھی۔ ان کی حب الوطنی مشہور تھی اور اسی کی تعلیم وہ بچوں کو بھی دیا کرتے تھے جب ہندوستان میں جنگ آزادی اپنے مقررہ وقت ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کے پہلے ہی ۱۰ مئی کو میرٹھ چھاؤنی میں شروع ہو گئی تو مولوی صاحب خاموش نہ رہ سکے، اور وہ بھی سر پر کفن باندھ کر میدانِ جنگ میں کود پڑے۔

الٰہ آباد کے قرب و جوار میں بہت سے مسلمان تعلقہ دار اور زمیندار تھے جو غدر کے زمانے میں خود مختار ہو جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے مولوی صاحب کو ہی اپنا رہنما بنایا اور دہلی کے بادشاہ ظفر کا انہیں نمائندہ مقرر کیا۔ مولوی صاحب خوش تھے کہ انہیں ملک کی خدمت کرنے کا اور اپنے دیرینہ ارمان پورے کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

مولوی صاحب کی وطن پرستی اور ولولہ انگیز تقریر دلکا ہی اثر تھا کہ سرکار کی چھٹی رجمنٹ باغی ہو گئی۔

انگریز الٰہ آباد کے قلعے میں محو رقص و سرود تھے۔ جب انہیں اس امر کی خبر ملی تب تو ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین ہی سرک گئی۔ کیونکہ ان کی وفاداری کا انہیں بالکل یقین تھا۔ جن پیتوں پر انہیں بھروسہ تھا جب وہی ہی ہوا دینے لگے تو ان کا گھبرانا لازمی تھا۔ مولوی صاحب کی انقلابی تلوار کی زد میں آکر کوئی بھی انگریز زندہ نہ بچا۔ انگریز چیخے الاماں،

الاماں پکار رہے تھے۔ مجاہد آزادی بہادر شاہ ظفر کی جے بول رہے تھے۔ اس جنگ میں میواتیوں نے بھی بڑی بہادری دکھائی تھی۔ انہوں نے باغیوں کا ساتھ بھی دیا تھا۔ ان کے پاس ہمت کی نہیں بلکہ لڑائی کے لئے اچھے اسلحے کی کمی تھی.... جیساکہ میں عرض کرچکا ہوں۔ اسی لئے وہ ناکامیاب رہے۔

انگریزوں نے اپنی سکھ اور گورکھا فوج کی مدد سے پہلے الہ آباد کو لوٹا یا اور بعد ازاں آگ بھی لگادی تھی۔ کٹنے اور مرنے کے لئے وہ دیسی فوج کو ہی سامنے رکھتے تھے اور ان کا توپ خانہ ان کے عقب میں چلتا تھا۔ اپنے ہی بھائیوں نے جب انگریزوں کا ساتھ دیا تو مولوی صاحب نے خسرو باغ سے اپنا کیمپ اکھاڑ دیا اور ۱۷ جون ۱۸۵۷ء کو آخری جنگ لڑکر وہ کچھ باغیوں کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے اور وہاں وہ باغی بیگم حضرت محل کی فوج کے سپہ سالار ہوگئے اور وہیں پھر انگریزوں کے ساتھ لڑتے ہوئے انہوں نے شہادت پائی تھی شہید وطن مولوی لیاقت علی زندہ باد۔

شہید احمد یار خاں

شہید احمد یار خاں افغان پٹھان تھے۔ ان کا خاندان ۱۸۵۷ء کے غدر سے بہت پہلے ریاست رام پور میں آکر بس گیا تھا۔ یہ خاندان جنگ جو تھا۔ ریاست کے نواب نے اس خاندان کے لوگوں کی بڑی عزت کی اور انہیں اپنی فوج میں عہدے دیئے اور ان کی گزر اوقات کے لئے ریاست کا کچھ حصہ بھی دے دیا۔ نواب صاحب نے احمد یار خاں کو شاہجہاں پور کی تحصیل جلال آباد کا تحصیلدار بنادیا۔

احمد یار خاں جتنے لائق حکمراں تھے، اتنے ہی وہ وطن پرست بھی تھے۔ ایامِ غدر جسے ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کہنا چاہیئے۔ احمد یار خاں نے بڑی بہادری کے کام کیئے تھے۔ اور شہرت حاصل کی تھی

جس وقت انگریزی فوجیں فتح گڑھ اور فرخ آباد کے شاہراہ پر دریائے گنگا کو عبور کر کے جلال آباد کی طرف بڑھنا چاہتی تھیں۔ تبھی احمد یار خاں نے انہیں جا روکا تھا۔ دونوں طرف سے خوفناک لڑائی ہوئی تھی۔ احمد یار خاں کی فوجوں نے فرنگیوں کے بہت سے سپاہیوں اور عہدیداروں کو بھیج دیا گھاٹ پر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ لیکن قرب و جوار کے چندیل راجپوت غدار نکلے۔

انہوں نے احمد یار خاں کی کوئی مدد نہیں کی اور انگریزوں کی مدد کی۔ اس غداری کے باعث احمد یار خاں جنگ ہار گئے۔ اگر ان چندیل راجپوتوں نے کہیں احمد یار خاں کا ساتھ دیا ہوتا تو انہوں نے سبھی انگریزوں کو دریا میں ڈبا دیا ہوتا۔ لیکن کچھ میر جعفروں نے انہیں گرفتار کرا دیا۔

انگریز احمد یار خاں کو گرفتار کر کے جلال آباد کے قریب فوجی چھاؤنی میں لے گئے۔ فوجی عدالت نے اس کو پھانسی کا حکم سنا دیا۔ سزا سنا دیئے جانے کے بعد فوجی افسر نے ان سے سوال کیا۔

"کیا تم اپنی جاں بخشی کے لئے معافی مانگنا قبول کرتے ہو۔ کیونکہ تم ایک بہادر ہو۔" لیکن اس قوم پرست نے جواب دیا۔

"ہرگز نہیں!"

جواب سن کر حاکم آگ بگولہ ہو گیا۔ انہیں ایک بوڑھے

میں بند کرنے کا حکم دیا۔ اس بورے کو جلال آباد کے قریب ایک آم کے پیڑ سے لٹکا دیا گیا، بورے میں بند شدہ رسی کو کئی بار اوپر نیچے کھینچ کر پٹخیاں دی گئیں۔ اس وقت تک اسے زمین پر پٹکتے رہے۔ جب تک ان کا دم نہیں نکل گیا۔ وہ منحوس تاریخ اپریل ماہ ۱۸۵۷ء کی ۸ ار تھی۔ وحشی انگریزوں نے جلال آباد کی ان کی کوٹھی کو اور کل قصبہ کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔

شہید نظام علی خاں

شہید نظام علی خاں کے بزرگ افغانستان سے آکر شاہجہاں پور میں مقیم ہو گئے تھے۔ اس خاندان کے لوگوں نے قرب وجوار کے تعلقہ داروں کو مغلوب کر کے اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ نظام علی ۱۸۰۰ء میں تماچیاز نگر میں پیدا ہوئے تھے۔ جو شاہجہاں پور کے قریب ہے۔ نواب نظام علی خاں ترین قبیلے کے شہید نواب دلیر خاں کی تیسری پیڑھی میں سے تھے۔ یہ بہت خوبصورت اور توانا تھے۔ پہلوانی کا بھی شوق تھا۔ انگریزی فوجیں کانپور کو فتح کرنے کے بعد شاہجہانپور کی طرف بچھو دیہ کے گنگا گھاٹ سے ہو کر بڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے ان کو آگے بڑھنے سے روکا ۲۵ اپریل ۱۸۵۷ء کو جنگ چھڑ گئی۔ انگریزوں کی کمک کے لئے بریلی اور کانپور سے فوجیں آگئیں۔ ۲۶ اپریل کو پھر خوفناک لڑائی ہوئی۔ ہزاروں کی تعداد میں دونوں جانب سے فوجی مارے گئے شام ہو جانے پر لڑائی بند ہو گئی۔ اب نواب صاحب اپنے زخمی فوجی جوانوں کو دیکھنے گئے۔ کسی ایک غدار جاسوس نے یہ خبر انگریز جنرل تک پہونچا دی تو اس نے عہد شکنی کی پھر گولے برسانا شروع

کر دیا۔ ایک گولہ نواب صاحب کو لگا اور وہ وہیں شہید ہو گئے۔

شہید حافظ مولوی احمد اللہ شاہ

اُس سے کہنا ہی پڑے گا کہ وہ ہے ننگِ وطن
ملک اور قوم کا جو شخص وفادار نہ ہو

حافظ مولوی احمد اللہ شاہ ملک و قوم کے ان وفاداروں میں تھے۔ جن پر ملک کے ہر انسان کو ناز ہونا چاہیئے۔ لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنے شہیدوں کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں اور جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے ہیں۔ جو شخص اپنے وطن کے لئے قربان ہو جاتا ہے وہ شہید کہلاتا ہے اور شہید کا مرتبہ اس لئے بھی بلند ہے وہ ذات پات سے مذہب و ملت سے دور ہو جاتا ہے۔ ایک انسان میں جب انسانیت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کسی کے دکھ درد پر آنکھوں میں آنسو امڈ آتے ہیں اور وہ ہر قسم کی قربانیوں کے لئے تیار رہتا ہے۔ تمام پریشانیوں کا وہ بڑی ہمت سے مقابلہ کرتا ہے۔ جب ایک مقصد کے لئے جدوجہد ہو تو ارادوں میں پختگی آ ہی جاتی ہے۔ ملک کی آزادی کا جذبہ ہندو اور مسلمان کے دلوں میں ایک طوفان کی طرح موجزن تھا۔ ہر شخص اپنے طور پر "لڑیں اور مریں" کی تحریک پر عمل کر رہا تھا۔ ہر ہندوستانی یہ جانتا تھا کہ ملک کے لئے اپنی جان دے دیں گے تو مر کر امر ہو جائیں گے۔ شہیدوں میں شمار ہوگا۔ آنے والی نسلیں ان کے کارناموں کو یاد کریں گی۔ اگر زندگی رہی تو غلامی کا طوق گلے سے نکال کر عزت سے جیئیں گے۔ دراصل یہ ایک قسم تھی۔ ایک مقصد تھا۔ ایک تحریک تھی۔ پورا ملک اس منظم پروگرام پر عمل کر رہا تھا۔

اس لئے جہاں بھی شہیدوں کا خون گرا ہے۔ وہ زمین پاک ہے۔ اسے عقیدت کے طور پر پیشانی سے لگانا چاہیئے۔ اگر یہ مجاہدین نہ ہوتے تو آج ہم آزادی کی فضا میں کبھی سانس نہ لے سکتے تھے۔ ؎

لگاؤ آنکھوں سے اس خاکِ پاک کو پیتا
لہو سے جس کو شہیدوں نے لالہ زار کیا

مولوی احمد اللہ شاہ کا خاندان زمانہ قدیم میں ہردوئی (ضلع اتر پردیش) میں بودو باش تھا۔ بعد ازاں یہ خاندان دکھن مدراس چلا گیا۔ مولوی صاحب مدراس میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ٹیپو سلطان کی فوج میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔

مولوی احمد اللہ شاہ کے والد ماجد کی یہ خواہش تھی کہ ان کا پیارا بیٹا بھی وطن پرست بن کر کچھ ایسے کارنامے کر دکھائے جس سے خاندان کے ساتھ وطن کا نام بھی بلند ہو۔ ان کے وطن پرست والد انہیں انگریزوں کے ظلم و ستم کے اور ان کے ذریعہ ملک پر قبضہ کرنے کے انہیں قصے سنایا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچپن سے ہی احمد اللہ میں وطن پرستی کے جذبے نمودار ہوگئے تھے۔ بعد میں وہ ایک بہت بڑے وطن پرست ثابت ہوئے جنہوں نے اپنی پوری زندگی ہی ملک و قوم کے لئے وقف کر دی۔ ان کے اس کام میں ایک روشن ضمیر درویش کا بھی ہاتھ تھا۔ احمد اللہ شاہ، غوث صاحب کے مرید بننا چاہتے تھے۔ انہوں نے ان کے سامنے یہ شرط رکھی کہ ان کا مرید وہی ہو سکتا ہے جو اپنے وطن کی آزادی کے لئے قربانی دے سکے۔ اس بات کے لئے وہ پہلے ہی سے تیار تھے۔ انہوں نے فوراً وطن کی آزادی کے لئے قربانی دینے کا وعدہ کر لیا اور غوث صاحب کے مرید بن گئے۔ انہوں نے کئی برس تک اپنے پیر و مرشد کی خدمت کی۔

غدر کے زمانے میں احمد اللہ پہلے لکھنؤ اور پھر کان پور تشریف لے گئے۔ یہاں ان کی ملاقات بانی غدر نانا صاحب پیشوا، تانتیا ٹوپے، عظیم اللہ خاں وغیرہ سے ہوئی اور یہ بھی انہیں کے انقلابی رنگ میں رنگ گئے۔ انہوں نے جھانسی کی رانی لکشمی بائی سے بھی ملاقات کی تھی۔ جب مولوی صاحب کو معلوم ہوا کہ انگریزوں نے فیض آباد کی بابری مسجد کو لے کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فساد کرا دیا ہے تو وہ فیض آباد پہنچ گئے۔ مولوی صاحب کی شیریں گفتاری اور جادو بیانی مشہور تھی۔ ان کی مؤثر تقریروں کا دونوں فرقے کے لوگوں پر اچھا پڑا، لیکن ان کی تقریروں کا خراب اثر صرف انگریزوں پر پڑا۔ جو دو فریقین کو لڑانا چاہتے تھے۔ مولوی ان میں صلح چاہتے تھے۔ انگریزوں نے مولوی صاحب کو گرفتار کر لیا۔ پھر انہیں فیض آباد کی جیل میں بند کر دیا گیا۔ حافظ مولوی احمد اللہ صاحب نے اپنے خیالوں سے اور پرجوش تقریروں سے عوام کا دل جیت لیا تھا۔ ان کی گرفتاری پر عوام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ انگریزوں کے خلاف احتجاج بلند کیا۔ اس ہنگامہ آرائی میں جیل کے پھاٹک توڑ ڈالے اور مولوی صاحب کو رہا کرا لیا

مولوی صاحب کے ساتھ کافی تعداد میں نوجوان ہو گئے تھے۔ کچھ فوجی لوگ بھی اس ٹیم میں آ ملے تھے۔ اب وہ اپنی فوج کو لے کر لکھنؤ گئے اور بیگم حضرت محل سے ملاقات کی۔ مولوی صاحب نے لکھنؤ میں بھی انگریزوں کے خلاف پرجوش تقریر کی ان کی اشتعال انگیز تقریروں سے متاثر ہو کر اور بھی لوگ ان کی فوج دس ہزار اشخاص تک پہونچ گئی۔ جس میں ۱۲۰۰ سوار تھے۔ بیگم حضرت محل کے ایک وزیر نے بیگم کو بہکا دیا کہ یہ وقت انگریزوں کے ساتھ لڑنے کا نہیں ہے۔ خیر پھر بھی وہ انگریزوں کے ساتھ لڑے اور کئی مقامات پر فتح بھی پائی۔ وہ ۸ جون ۱۸۵۶ء کو معہ اپنے لشکر کے شاہجہاں پور چلے گئے۔ شاہجہاں پور میں فوجی

افسر کیمپ ویل پہلے ہی کیمپ ڈالے پڑا تھا۔ مولوی صاحب نے اسے بھگا دیا۔ اب وہ بجپور یا گنگا گھاٹ (ضلع گڑھ) اپنی فوج لے گئے۔ کیونکہ اُدھر سے انگریز شاہجہاں پور کے علاقے میں داخل ہو گئے تھے۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ایک گولی کے لگنے سے مولوی صاحب زخمی ہو گئے۔ انہیں علاج کے لئے شاہجہاں پور لایا گیا۔ ایک جراح نے ان کا علاج کیا۔ پھر وہ اچھے ہو گئے۔ لیکن وہ خاموش بیٹھنے والے انسان ہی نہ تھے۔

پوایاں (شاہجہاں پور) کا راجہ جگنا تھ انگریزوں کا غلام تھا۔ اسے ہی مولوی صاحب نے ایک سخت خط لکھا کہ انگریزوں کی غلامی چھوڑو۔ تمہارے یہاں جو انگریز ہیں انہیں میرے حوالے کر دو۔ اگر نہیں تو جنگ کے لئے تیار رہو۔"

مولوی صاحب کا خط پاکر راجہ نے اپنے مصاحبوں سے مشورہ کیا، اور طے ہوا کر مولوی صاحب کو ایک خط لکھ کر محل میں آنے کی دعوت دی جائے۔ اور ان کی تمام شرطیں قبول کر لی جائیں مولوی صاحب جب اپنی ہتھنی پر سوار ہو کر محل میں اکیلے پہونچے تو دھوکے باز راجہ نے ان کا استقبال ایک پان سے کیا۔ جس میں زہر تھا۔ جب مولوی صاحب کی زبان اینٹھنے لگی تو وہ فوراً سمجھ گئے کہ ان کے ساتھ دھوکا کیا گیا۔ زہر دینے والے کو مار کر وہ وہیں شہید ہو گئے۔ اگر مولوی صاحب کو دھوکے سے زہر دے کر اس غدار راجہ نے نہ مار ڈالا ہوتا تو مولوی صاحب نے اس غدار راجہ کا سر ہی قلم کر ڈالا ہوتا۔ اب اس راجہ نے مولوی صاحب کا سر کاٹ کر بڑی نزاکت کے ساتھ اسی فوجی افسر کے پاس لے گیا اور اپنی غداری کا پختہ ثبوت دیا۔ ایسے ہی غداروں کی وجہ سے ملک صدیوں انگریزوں کا غلام بنا رہا۔

اس فوجی افسر نے مولوی صاحب کا سر صدر بازار کے

چوراہے پر ایک لمبے بانس پر باندھ دیا، اور عام مظاہرے کے لئے وہاں نصب کر دیا۔ یہ جگہ شاہجہاں پور کی کوتوالی کے پاس ہے۔ مولوی صاحب کے کٹے سر نے وہ کمال دکھایا جو مولوی صاحب سر کو اپنے کندھوں پر رکھ کر بھی نہیں دکھا سکتے تھے۔ شاہجہاں پور میں بغاوت ہو گئی۔ نظام آباد کے باغی لوگ رات میں آکر مولوی صاحب کا کٹا سر دریا کھوٹ لے گئے اور بڑے احترام کے ساتھ اسے دفنا دیا۔

انگریزوں کو جب پتہ چلا کہ وہ سر نظام آباد کے لوگوں نے اتارا تھا تب انہوں نے اپنا غصہ اس گاؤں پر اتارا اور توپیں لگا کر پورے گاؤں کو لاشوں کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔ سینکڑوں مسلمان شہید ہوئے تھے۔

حافظ مولوی احمد اللہ شاہ زندہ باد

مجاہدین کو الہ آباد میں پھانسی

عوام کی بغاوت کو دبانے کے لئے انگریزوں نے الہ آباد شہر کو ہی برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ قریب ۸۰۰ باغیوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ جنرل نیل نے ان تمام باغیوں کو پھانسی پر چڑھا دیا تھا۔ جن میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے لوگ تھے۔ ان کا خون ایک ہو کر بہا تھا۔ یہ تو معلوم ہوا لیکن ان مرنے والوں میں کتنے ہندو تھے اور کتنے مسلمان تھے یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا۔

ان دنوں الہ آباد کے اجڑے ہوئے چوک کے علاقے میں سات بڑے نیم کے درخت تھے۔ انگریزوں نے عوام کو خوفزدہ کرنے کے لئے ان ۸۰۰ مجاہدین جنگ آزادی کو انہیں نیم کے درختوں پر قطار در قطار لٹکا کر پھانسی دلوادی۔

الہ آباد تو خود ہی ایک پاک مقام ہے مگر ۸۰۰ ہندو مسلم شہیدوں نے اسے پاک سے پاک ترین بنا دیا۔

جس پیارے وطن کی آزادی کے لئے ۱۸۵۷ء میں ہندو، مسلمانوں نے اپنا مشترکہ خون بہایا تھا۔ کیا ان سے اب یہ امید رکھنا مناسب نہ ہوگا کہ آزادی کی حفاظت کے لئے بھی وہ اپنا مشترکہ خون بہانے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔

متفرق مجاہدینِ آزادی

۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۹ء

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں حصّہ لینے والے کچھ ایسے مشہور مجاہدین ہیں۔ جن کے حالاتِ زندگی مکمل طور پر نہیں ملتے ہیں۔ اگر کچھ معلومات فراہم کر سکا تو آگے صفحات میں روشنی ڈالی جائے گی۔ یہاں صرف ان کے نام پیش کر رہا ہوں۔

(۱) اعجاز علی خاں اور حیدر علی خاں (راجگیر)
(۲) پیر علی خان اور رادھا ف حسین (پٹنہ)
(۳) احمد خاں (ملتان) الٰہی محمد بخت خاں (روہتک)
(۴) محمد خاں (بجنور)
(۵) پرنس فیروز شاہ (دہلی)
(۶) بیگم حضرت محل (لکھنؤ)
(۷) محمد حسین (گورکھپور)
(۸) حیدر علی خاں (گیا)
(۹) صوبے دار علی بخش (ہمیرپور، اترپردیش)
(۱۰) وارث علی (پٹنہ)

(۱۱) مولوی سرفراز علی (شاہجہاں پور)
(۱۲) محمد احمد اللہ (لکھنؤ)
(۱۳) بہادر خاں (بریلی)
(۱۴) بختیار خاں (کانپور)
(۱۵) عظیم اللہ خاں (کانپور)

ان سب مجاہدین جنگ آزادی کو ہمارا عقیدت بھرا سلام ہے۔

شہید غلام غوث

غلام غوث جھانسی کی رانی کا توپچی تھا۔ وہ کوئی معمولی توپچی نہیں تھا۔ وہ بہت ہوشیار۔ نشانے باز اور رانی کا بہت ہی وفادار توپچی تھا۔ جب تک وہ زندہ رہا انگریز جھانسی کے قلعہ کو فتح نہیں کر سکے تھے۔ رانی کو بھی اپنے اس توپچی پر بڑا ناز تھا۔ لیکن انگریزوں نے اتنی زوروں کی بمباری کی کہ قلعہ کی دیواریں ٹوٹ گئیں۔ ایک گولی آکر غلام غوث کو لگی جو قاتل ثابت ہوئی۔

شہید خدا بخش

خدا بخش بھی ایک بہادر اور رانی جھانسی کا وفادار توپچی تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں انگریزوں کے ساتھ رانی جھانسی کی لڑائی ہوئی تھی۔ رانی کی فوج میں ہزاروں پٹھان تھے۔ وہ سب لڑائی میں مارے گئے تھے۔ کچھ چند پٹھانوں کا نام تاریخ میں ملتا ہے۔ خدا بخش بھی انگریزوں کی گولی کھا کر شہید ہو گیا تھا۔ ان دونوں کی موت پر رانی نے بہت افسوس کیا تھا۔ رانی نے اپنے محل کے

کے احاطے میں ان دونوں بہادر پٹھان توپچیوں کی قبریں بنوائی تھیں اور وہاں پر اپنی عقیدت کے پھول چڑھاتے تھے۔

شہید سردار برہان الدین

رانی جھانسی کی فوج میں پٹھانوں نے اپنی کمال کی بہادری اور وفاداری کا ثبوت دیا تھا، اور ہزاروں پٹھانوں نے جھانسی بچانے کے لیے اپنی قربانی دی تھی، جس وقت رانی انگریزوں میں گھر گئی تھی۔ اغلب تھا کہ کوئی انگریز رانی پر قاتلانہ حملہ کر دیتا اسی وقت ایک شخص تلوار لے کر اپنے گھر سے نکل پڑا۔ پھر اس زور سے اس نے تلوار چلائی مسکہ انگریزوں کو میدان چھوڑ کر بھاگنا ہی پڑا تھا۔ مگر وہ بھی سخت زخمی ہو گیا تھا۔ رانی پھر تھوڑے سپاہیوں کے ساتھ وہاں آ پہونچی۔ رانی نے اُسے قریب سے پہچانا تو معلوم ہوا کہ وہ ان کی ہی فوج کا سردار برہان الدین تھا۔ جس نے کسی وجہ سے نوکری سے استعفیٰ دے رکھا تھا۔ وہ جاں بلب تھا۔ رانی نے اس کے سر پر پیار کا ہاتھ پھیرا اور کہا تم ایک اچھے بہادر سپاہی ہو۔ اس کی زبان سے نکلا "حضور معافی"۔ رانی نے کہا: "معاف کیا"۔ اس نے زور لگا کر کہا: "سرکار جان نہیں نکلتی ہے میری وہ چٹھی" (چٹھی یعنی اس کا استعفیٰ رانی کی جیب میں تھا) رانی نے کہا: "یہ لو اپنا استعفیٰ"۔ اس نے کہا۔ "پھاڑ ڈالو"۔ رانی نے اس کے ٹکڑے کر دیئے تو اس نے اپنی جان شیریں جان آفریں کے سپرد کر دی۔ رانی اپنے اس وفادار سردار کی نعش کو اٹھوا لے گئی اور اپنے محل میں اس کو دفنا دیا۔

مجاہد گل محمدؐ

رانی جھانسی کی فوج میں زیادہ تر مسلمان پٹھان تھے۔ جو ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر بہادر تھے، رانی کے وفادار تھے۔ گل محمد تو رانی کا وہ وفادار سیوک تھا۔ جو آخری دم تک ان کے ساتھ تھا اور اس نے خود رانی کی چتا بنائی تھی۔ اس کے ساتھ کے ۰۰۰ھ پٹھانوں میں سے ۳۰۰ لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔ اس نے سینکڑوں انگریزوں کو خود اپنی تلوار سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

۱۸ ر جون ۱۸۵۸ء کے دن جب ایک انگریز نے رانی کے سر پر تلوار کا وار کیا جس سے ان کے سر کا داہنا حصہ کٹ گیا تھا اور داہنی آنکھ لٹک گئی تھی۔ اس انگریز کے دو ٹکڑے گل محمد کی تلوار نے ہی کئے تھے۔ جس وقت رانی بے ہوش خون آلود پڑی تھی۔ تو وہ اپنا منہ پھیر کر رو پڑا تھا اور کہہ رہا تھا۔ خدا پاک پروردگار رحم کر۔ رگھوناتھ سنگھ اور دیش مکھ کے ساتھ گل محمد نے رانی کی نعش کو بابا گنگا داس کی کٹیا کے قریب گھاس کے ڈھیر پر رکھا اور پھر اسے نذرِ آتش کر دیا۔ ادھر رانی کی نعش جل رہی تھی تو ادھر گل محمد کا دل جل رہا تھا۔ کیا ایسے بھی وفادار پٹھان مسلمان ہوتے ہیں آج ؟ گل محمد زندہ باد۔

شہید شیخو خاں پہلوان

میاں شیخو خاں پنجاب کے خاندانی پہلوان اور وطن پرست تھے۔ ان کے والد دلاور خاں بھی اپنے وقتوں کے ایک مشہور پہلوان تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں وہ پنجاب کے محمد پور قصبے میں رہائش پذیر تھے۔ تعظیماً لوگ انہیں خلیفہ کہا کرتے تھے۔ قرب و جوار

میں ان کا بڑا رعب تھا۔ ان کا ایک ہی دلارا بیٹا تھا۔ جسے وہ شیخو کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کا بیٹا بھی انہیں کی طرح مشہور پہلوان ہوا۔

پندرہ یا سولہ سال کی عمر سے ہی وہ اکھاڑے میں زور آزمائی کرنے لگے تھے، اور اپنے سے بڑے بڑے پہلوانوں کو جیت کرنے لگے تھے۔ لیکن شیخو پہلوان بہت نیک دل، وطن پرست اور انصاف پسند تھے۔ انگریزوں کی غلامی کو وہ حقارت سے دیکھتے تھے۔ اپنے ملک کو آزاد دیکھنے کے لیے وہ بے قرار رہا کرتے تھے۔ انہیں انگریزوں سے کس قدر نفرت تھی۔ اس کا مظاہرہ کر کے جب انہوں نے دکھا دیا تب تو ان کی شہرت کو ہی چار چاند لگ گئے۔

ایک دن شیخو پہلوان اپنی گھوڑا گاڑی پر سوار ہو کر بازار جا رہے تھے۔ راستے میں چار انگریز نکلے۔ کالے آدمی کو اپنے سامنے گھوڑا گاڑی پر سوار دیکھ کر وہ بوکھلا گئے، اور جبرًا اس پر سوار ہو گئے۔ شیخو کی عمر اس وقت صرف ۱۸ سال تھی لیکن وہ تھے آخر توانا پہلوان، جوانی کا جوش تو تھا ہی حریت کا خون بھی ان کی رگوں میں رواں دواں تھا۔ ایک انگریز نے شیخو پہلوان کو کالا آدمی کہہ کر مخاطب کیا، اور کہا "ہم کو اگلے چوک تک جانا مانگتا ہے، کالا آدمی تم جلدی چلو۔!"

شیخو پہلوان نے ان چاروں انگریزوں کی بھرے بازار میں ایسی پٹائی کی کہ انہیں اپنی نانی یاد آ گئی اور چاروں بے ہوش ہو گئے انہیں لوگوں نے اسپتال پہونچا دیا، اور شیخو پہلوان کو گرفتار کر لیا گیا، ان پر مقدمہ کیا گیا۔ لیکن انگریز مجسٹریٹ نے یہ کہہ کر وہ مقدمہ خارج کر دیا کہ ایک کالے آدمی نے چار انگریزوں کو اکیلے ہی پیٹ دیا اس سے تو انگریز قوم کی بد نامی ہو گی اور اس نے شیخو پہلوان کو باعزت رہا کر دیا۔

شیخو پہلوان نے پنجاب کی انقلابی پارٹی سے رابطہ قائم

کیا اور پھر ملک کی آزادی کے لئے سرگرداں رہنے لگے - پارٹی کی انہوں نے مالی امداد کی اسلحہ کی کمی بھی پوری کی ۔ انہوں نے ایک تھانہ کو لوٹ کر اس کے تمام اسلحہ اٹھا لائے تھے تھانہ کے لوٹ لئے جانے سے سرکار کا دماغ پھر گیا - وہ شیخو پہلوان کی تلاش زور و شور سے کرنے لگی لیکن وہ اس وقت ان کا سراغ پانے میں قاصر رہی شیخو خاں نے اپنے چند ساتھیوں کو لے کر سرکاری خزانہ بھی لوٹ لیا اور اپنی پارٹی کو مالی مدد پہونچائی -

پولس انقلابیوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی - ان کے والد کو سرکار نے گرفتار کر لیا تاکہ ان کی ہمت ٹوٹ جائے لیکن پولس اپنے مقصد میں ناکام رہی - بعد میں ان کے والد کو رہا کر دیا گیا - مگر ان کی گرفتاری اور رہائی شیخو پہلوان کو متاثر نہ کر سکی -

لیکن یہ بات پھر کہنی پڑتی ہے کہ اس ملک میں غداروں کی کمی نہیں ہے - ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں - ایک غدار وطن سے سراغ پاکر پولس نے شیخو پہلوان کے انقلابی اڈے کو جا گھیرا - انہوں نے ایک خفیہ دروازے سے اپنے ساتھیوں کو وہاں سے بھگا دیا - اور خود پولس کے ساتھ جوجھنے لگے - انہوں نے کئی پولس والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا - لیکن وہ خود بھی شہید ہو گئے -

ایسے تھے ہمارے محب وطن - جنہوں نے ملک کی آزادی کے لئے مرنا پسند کیا ، لیکن جھکنا نہیں -

آج ان جملوں کو سپرد قلم کرتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ ہم میں کتنے ایسے ہیں جنہیں خوددار اور حوصلہ مند شیخو پہلوان یاد ہے - کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے ان شہیدوں کو قوم فراموش کر چکی ہے -

محب وطن شیخو پہلوان زندہ باد

مشہور مجاہد جنگِ آزادی بیگم حضرت محل

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے مجاہدوں میں بیگم حضرت محل کا نام بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ بیگم حضرت محل ایک خودار خاتون تھیں۔ ان کے شوہر نواب واجد علی شاہ نے انگریزوں کی تمام شرائط قبول کر لینے کی آمادگی بھی ظاہر کی تھی مگر حضرت محل کچھ اور ہی مٹی کی بنی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ان شرطوں کو مان لینے میں سلطنت کی توہین سمجھی اور برسرِ پیکار ہو گئیں۔ ہاتھی پر سوار ہو کر انہوں نے انگریزوں کے خلاف اپنی فوج کی رہنمائی اور ہمت افزائی کی اور مہینوں (جون۔ جولائی ۱۸۵۷ء میں) انگریزی فوجوں کا دلیرانہ مقابلہ کیا۔ مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اور ناکامی کی خاص وجہ یہ تھی کہ گورکھے اور سکھ انگریزوں کی جانب سے لڑ رہے تھے۔ اور ان کے پاس اچھے قسم کے اسلحہ بھی تھے۔

بیگم با دلِ ناخواستہ نیپال چلی گئیں وہاں ناناصاحب بھی گئے ہوئے تھے۔ ناناصاحب کے ساتھ ۳۰ر دسمبر ۱۸۵۸ء میں انہوں نے نیپال میں بھی انگریزوں کا ناکامیاب مقابلہ ندی کے ساحل پر کیا تھا۔ اور وہیں وہ فوت ہو گئی تھیں۔ انگریزوں نے اُن کے بعد لکھنؤ کو تباہ و تاراج کر ڈالا تھا۔ لیکن بیگم حضرت محل تاریخ میں امر رہیں گی۔

شہید پیر علی

شہید پیر علی یوں تو اودھ کے رہنے والے تھے مگر وہ پٹنہ (بہار) چلے گئے تھے، اور وہیں انہوں نے کتابوں کی دکان کر لی تھی۔ وہ وطن پرست تھے اور ان کے خیالات انقلابی تھے۔ انگریزوں کی غلامی

انہیں کسی حالت میں قبول نہیں تھی۔ وہ اچھے سمجھ دار نوجوان تھے اوران میں جوانی کا جوش تھا اور شاید وہ یہ بھی سمجھتے تھے۔ حب وطن کا مزہ شباب میں ہے۔ پھر میں پھر یہ روانی رہے نہ رہے۔ لکھنؤ، کان پور کی طرح پٹنہ بھی ۱۸۵۷ء میں انقلابیوں کی میٹنگیں ہوا کرتی تھیں، اور پیر علی انقلابیوں کے لیڈر تھے۔ ۳ جولائی ۱۸۵۷ء کو پٹنہ کے انقلابیوں نے مل کر پیر علی کے مکان پر انقلابیوں کے لئے ہرا پرچم لہرا دیا اور اپنی ٹولی بنا کر وہ شہر میں انقلاب کا پیغام سب کو سنانے لگے۔ ڈاکٹر لائل انہیں روکنے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر آیا تب پیر علی نے وہیں اس کا کام تمام کر دیا، اور انگریزوں کے خلاف نعرے لگانے لگے۔ سکھ فوج نے آکر انہیں گرفتار کر لیا۔

کمشنر ٹیلر کے اجلاس میں پیر علی کے مقدمہ کی شنوائی ہوئی وہ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان کا جسم خون آلود تھا۔ لیکن ان کی پیشانی اونچی تھی اوران کے چہرے پر رعب تھا، وہ بے خوفی کے ساتھ ٹیلر کی جانب دیکھ رہے تھے۔

کمشنر ٹیلر نے نوجوان اور جوشیلے پیر علی کو جان بخشی کا لالچ دیا۔ اس نے کہا کہ اگر تم اپنے تمام انقلابی ساتھیوں کے نام بتا دو اور اپنے خفیہ انقلابی مرکزوں کا مجھے پتہ بتا دو تو میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں۔ اگر نہیں قبول ہے تو میں تم جیسے خطرناک باغی کو موت کی سزا سنا دوں گا۔" پیر علی کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو گئیں، اور اس نے کڑک کر کہا: "مجھے مرنا منظور ہے مگر اپنے ملک کے ساتھ غداری کرنا قبول نہیں ہے۔ میں مروں گا۔ گولی کھا کر مروں یا پھانسی پر چڑھ کر مروں۔ اپنے وطن کی آزادی کے لئے مروں گا۔ یہ انگریز ہی قصوروار ہیں جنہوں نے ہمارے ملک کی آزادی چھین لی ہے۔"

ٹیلر پیر علی کے اس دلیرانہ جواب سے اپنے آپے سے باہر

ہو گیا اور اس نے پیر علی کو موت کی سزا سنا دی۔ سزا سن کر پیر علی نے کہا: "میرے خون سے لاکھوں پیر علی پیدا ہوں گے، جو انگریزی حکومت کو نیست و نابود کر دیں گے۔"

شہید سید حسن عسکری

دہلی میں بادشاہ کے دو لڑکوں اور ایک پوتے کو قتل نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ کئی خاص آدمیوں کو پھانسی پر بھی چڑھا دیا گیا تھا۔ انہیں شہیدوں میں ایک تھے سید حسن عسکری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے خاص آدمی اور مصلاح کار۔ بادشاہ نے کچھ خطوط ایران کے بادشاہ کو لکھے تھے۔ شاید ایک بادشاہ نے دوسرے بادشاہ سے مدد چاہی ہو۔ وہ خط کسی طرح انگریزوں کے ہاتھ لگ گئے۔ خطوط لکھ کر وہ بنارس چلے گئے تھے تاکہ کوئی ان پر شک نہ کرے۔ مگر وہ بچ نہ سکے۔ انگریزوں نے ان کو پھانسی پر چڑھا دیا۔

شہید بھائی بیگم شاہ زمانی

بیگم شاہ زمانی جن کا بڑا بھائی بادشاہ ظفر کے دربار میں تھا۔ وہ باغیوں کا لیڈر بھی تھا۔ جب انگریزوں نے دلی پر پھر سے قبضہ کر لیا تو انہوں نے ان لوگوں کی تلاش کی جنہوں نے غدر میں حصہ لیا تھا جنہوں نے بغاوت میں رہنمائی کی تھی۔ بہو بیگم شاہ زمانی نے چونکہ بغاوت کی رہنمائی کی تھی۔ لہٰذا انگریزوں نے اس کے بھائی کو لال قلعہ میں پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔

لگا دو آنکھوں سے اس خاکِ پاک کو گیتا
لہو سے جس کو شہیدوں نے لالہ زار کیا۔

مشہور مجاہدِ جنگِ آزادی عظیم اللہ خاں

جناب عظیم اللہ خاں محبِ وطن تھے، اور ایک عالم فاضل آدمی تھے وہ بڑے سمجھدار اور سلجھے ہوئے دماغ کے انسان تھے اور اسی وجہ سے وہ نانا صاحب پیشوا کے وکیل بن گئے تھے۔ نانا صاحب کو انگریزوں سے آٹھ لاکھ سالانہ پنشن ملتی تھی۔ مگر کچھ وقت کے بعد انگریزوں نے پنشن بند کر دی تھی۔ پنشن جاری کرانے کی کوشش میں انہیں لندن بھیجا گیا تھا مگر چونکہ انگریزوں کو پنشن نہیں دینی تھی اس لئے وہ پھر جاری نہ ہو سکی۔

۱۸۵۷ء کے غدر یا جنگِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ ان کا شمار جنگِ آزادی کے لیڈروں میں ہوتا تھا۔ ہر ہر مورچے پر انہوں نے نانا صاحب کا بڑی وفاداری سے ساتھ دیا تھا، اور ان کا ساتھ جبھی چھوڑا تھا جب نانا صاحب کانپور کے مغلوب ہو جانے کے بعد نیپال چلے گئے تھے اور ان کے محل بِٹھور کانپور کے محل کو لوٹ کر انگریزوں نے آگ لگا دی تھی۔ وہ کانپور چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے یہ نہ معلوم ہو سکا۔ لیکن جنگِ آزادی کے مجاہدوں میں ان کا نام صفِ اول میں ہے۔

شہیدِ وطن عزیزن بائی رقاصہ کانپور

عزیزن بائی رقاصہ ہندوستان کی وہ واحد رقاصہ ہے۔ جس نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس کی قربانی پر تو تمام ہندوستانیوں کو ناز ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے ماحول سے نکل کر باہر شہادت پانے کے لئے آگئی تھی جہاں عیش و عشرت، رقص و سرود کی ہر شب محفلیں ہوا کرتی تھیں۔

شاید وہ اس کے خاندانی خون کا ہی اثر تھا۔ وہ ایک چھتری کی لڑکی تھی جسے غنڈوں نے لاکر کانپور کی ایک طوائف کے ہاتھ محض پانچ سو روپے میں فروخت کر دیا تھا۔ وہ بہت زیادہ حسین تھی، کانپور کے چند انقلابی سرداروں سے اس کی شناسائی ہو گئی تھی، اور انہوں نے اس پر انقلاب کا رنگ چڑھا دیا۔ خاص طور پر وہ نواب شمس الدین سے زیادہ ربط ضبط رکھتی تھی، ان لوگوں نے اسے نانا صاحب اور تانتیا ٹوپے سے بھی ملا دیا تھا۔ نانا صاحب نے اور تانتیا ٹوپے نے اس کی بڑی عزت کی۔ اُسے اپنی بہن کہا اور تلوار نذر کر دی تب تو وہ نانا صاحب کی زر خرید غلام بن گئی۔ اس کا کام تھا انگریزوں کی چھاؤنیوں میں جانا اور ناچ گا کر سپاہیوں کو خوش کرنا اور انہیں انگریزوں کے ساتھ بغاوت کے لئے تیار کرنا۔ جب جب انگریزوں کے ساتھ لڑائی میں ہندوستانی فوج کے لوگ زخمی ہوتے تھے۔ وہ ان کی خدمت بھی کرتی تھی۔ پیاسوں کو پانی پلانا اور بھوکوں کو کھانا پہونچانا بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ جسے اس نے بڑی خوبصورتی سے انجام دیا تھا۔ اتنا ہی کیوں اس نے تو مستانی نام کی طوائفوں کی ایک ٹولی بنا کر جنگ میں تلوار بھی چلائی تھی۔ لیکن کانپور کی جنگ جیت کر کے بھی نانا صاحب ہار گئے تھے۔ وہ اس طرح کہ اسوقت انگریزوں کی ایک اور کمک آ گئی تھی۔

عزیزن کا دلی دوست نواب شمس الدین جب لڑائی میں شہید ہو گیا تو اسے دلی صدمہ پہونچا وہ ننگی تلوار لے کر انگریز قاتلوں پر ٹوٹ پڑی۔ بہتوں کو قتل کر کے وہ گرفتار ہو گئی۔ اس پر بغاوت کا مقدمہ چلا۔ جب جنرل ہیولاک نے اس حسینہ کو دیکھا تو وہ خود فریفتہ ہو گیا۔ اس سے کہا کہ وہ معافی مانگ لے اور عیش کی زندگی گزارے۔ اس نے معافی مانگنے سے صاف انکار کر دیا اور انگریزی سرکار کو ہی مردہ باد کہا تو اُس کے اشارے

پر اسے قتل کر دیا گیا۔ پھر پھانسی پر لٹکا کر گولیوں کا نشانہ بنایا گیا
شہید عزیزن بائی زندہ باد

بیگم شاہ زمانی کا تاریخی خط

بہادر شاہ ظفر بادشاہ کے شاہزادوں میں۔ بیگم زینت محل کے شکم سے پیدا ہوا ایک شاہزادہ جواں بخت نام کا تھا جسے اپنی چہیتی بیگم زینت محل کے اصرار پر انہوں نے اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا جو بدبختی سے کبھی تخت نشین نہ ہو سکا۔ اور رنگون (برما) کی قبر میں قبر نشین ضرور ہو گیا تھا۔ بیگم شاہ زمانی اسی بدبخت شاہزادہ کی بدبخت بیوی تھی۔ یہاں پر وہ خط نقل کیا جا رہا ہے جو بیگم شاہ زمانی نے دہلی میں رہنے والی اپنی والدہ کو لکھا تھا۔ اس خط کو پڑھنے سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ دہلی کے بادشاہ کو رنگون (برما) میں کن حالات میں اپنی زندگی بسر کرنی پڑی تھی۔

بمقام :۔ رنگون (برما)
دلی کے قیدی بادشاہ کا گھر

محترمہ والدہ صاحبہ کو میرا سلام

دلی پائے سلطنت سے ہزاروں کوس دور ایک جگہ کالے پانی کی سزا کاٹ رہی ہوں۔ ماں کا گھر چھوٹا تو ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔ کم سے کم میکے کے کسی شخص سے ملنے کی امید اس زندگی میں نہیں ہے سائیں سنبیل شاہ صاحب آپ کا خط لائے۔ جب وہ اسے پڑھ کر بادشاہ صاحب کو سنا رہے تھے تو میں چک کے پردے کے پیچھے سے دیکھ رہی تھی۔ بادشاہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں خط سنانے

کے بعد سائیں صاحب ولی عہد جواں بخت کے ساتھ میرے کمرے میں آگئے اور مجھے خط دیا۔ خط دیتے ہوئے وہ رو رہے تھے۔ کیونکہ میں جو کبھی ولی عہد کی بیوی تھی۔ آج میں یہاں ایک قیدی ولی عہد کی بیوی ہوں، اور قیدی سسر اور قیدی خوش دامن کی بہو ہوں۔ اب یہاں نہ لال قلعہ ہے.... نہ سات ڈیوڑھیاں اور نہ پہرے دار۔ یہاں تو برسات میں ٹپکنے والا ایک سادہ لکڑی کا گھر ہے۔ اس میں چند کمروں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ ایک کمرہ بادشاہ اور ملکہ کا ہے۔ دوسرا میرا اور ان کا۔ تیسرا نوکروں کا ہے اور چوتھا کمرہ کھانا پکانے کے لئے ہے۔ یہاں کی آب و ہوا میرے موافق نہیں ہے۔ برسات زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے مچھر زیادہ رہتے ہیں۔ مکان ٹوٹا پھوٹا اور پرانا ہے۔ بیماری ہاتھ دھوکر پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ کوئی نہ کوئی بیمار ہی نظر آتا ہے۔ بادشاہ اور ملکہ ہمیشہ بیمار رہتے ہیں۔ صرف وہ ہی (جواں بخت) ایسے ہیں جو خدا کے فضل سے بیمار نہیں رہتے ہیں۔

جب سائیں صاحب نے بتایا کہ بڑے بھائی صاحب مرزا فضل کی لڑکی اپنے والد صاحب کے لئے رویا کرتی ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جب بڑے بھائی صاحب کی نعش مکان پر لائی گئی تھی تب وہ بچی صرف چار سال کی تھی۔ اُن کی نعش کو دیکھ کر وہ کہنے لگی تھی۔ "ابا تو مجھ سے بولتے ہی نہیں۔ وہ تو آنکھیں بند کئے ہوئے سو رہے ہیں"۔ اس کی سادگی کی یاد میرے دل کو بے چین کر دیتی ہے اس زندگی میں اس کا دیدار کہاں؟ بچی سیدہ تو اب مرے ہوئے باپ کی یادگار ہے۔ مجھے اور دوسروں کو رلانے کے لئے..... اس زندگی میں دوبارہ دلی دیکھوں گی ایسی اُمید کرنا ہی فضول ہے۔

اب یہاں کی تنہائی میں نہ کوئی یار و مددگار ہے.... کوئی ہمدرد بھی تو نہیں ہے.... ہو بھی تو کیسے؟ بدبختوں سے ہمدردی کرنے والے

کو قید میں ڈالا جا سکتا ہے یا اسے پھانسی پر چڑھایا جا سکتا ہے،
یا اللہ.....

یہاں کی زبان بھی نرالی اور مذہب بھی نرالا ہے۔ یہاں کے لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم لوگ کون ہیں؟ ہمیں کیوں نظر بندی میں رکھا گیا ہے۔ ہم لوگ یہاں زندگی اور موت کی زندگی جی رہے ہیں۔ موت کے ہی آنے کا انتظار ہے.... سید کو میرا پیار دیجئے گا۔ اس کی بے وطن بوا کا پیار۔ اب تو زیادہ نہیں لکھا جاتا۔ والدہ صاحبہ کی اس کی بدبخت بیٹی کا سلام۔

شاہ جہاں

مجاہد جنگ آزادی کی داستان محبت

یہ داستان ۲۷ جون ۱۸۵۷ء کو شروع ہوئی تھی۔ اس تاریخ کو ستی چورا (کانپور، اتر پردیش) کے گنگا جی کے کنارے والے باغیوں نے کشتی میں سوار انگریز مرد، عورت اور بچوں کا قتل کر ڈالا تھا ان مقتولوں میں جنرل بھیلر کی ایک حسین نوجوان لڑکی بھی تھی۔ وہ پانی میں گر گئی تھی۔ اس کے بھیگے ہوئے کپڑے اس کے جسم سے چمٹ گئے تھے۔ اسی حالت میں مجاہد جنگ آزادی علی خاں کی اس پر نظر پڑ گئی۔ اور اس نے پہلی نظر میں ہی اسے اپنا دل نذر کر دیا۔ وہ اسے پانی سے سے نکال کر اپنے گھوڑے پر بٹھا کر لکھنؤ لے بھاگا۔ اور پھر کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ اگر دوسرے سپاہیوں نے اسے ایک انگریزی لڑکی کی جان بچاتے دیکھ لیا ہوتا تو اسے انہوں نے قتل کر دیا ہوتا۔ کانپور کا ستی چورا انگریزوں کے قتل عام کا مقام ہے۔ دوسرے سپاہیوں نے علی خاں کا تعاقب بھی کیا ہوتا مگر وہ اس کی ڈھول نہ پا سکے۔ انگریزوں نے کانپور اور لکھنؤ کو فتح کر لینے کے بعد مس بھیلر

کی بہت تلاش کی تھی مگر وہ ہمیشہ لاپتہ رہی ۔ وہ کسی حرم سرا کی زینت بڑھا رہی تھی ۔ مجاہد علی خاں نے اس کے ساتھ نکاح کر لیا تھا، وہ ایک پردہ نشین بیوی کی زندگی بسر کر رہی تھی ۔

مُجاہدِ جنگِ آزادی سپاہی محمد علی

سپاہی محمد علی نانا پیشوا کی فوج کا جاسوس تھا۔ اس کا کام تھا انگریزوں کی نقل و حرکت کی خبر نانا صاحب کے فوجی سرداروں تک پہونچانا۔ وہ اپنا کام ایمانداری سے انجام دے رہا تھا۔

فاربیس مچل نے اپنی ڈائری میں اس کے بارے میں لکھا ہے۔

" انگریزی فوج کانپور کو فتح کر لینے کے بعد لکھنؤ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اناؤ کے قریب نانا کی فوج کا جاسوس مسمیٰ محمد علی پکڑ لیا گیا تھا۔ اس سے دوران جانچ پڑتال جب فاربیس مچل نے پوچھا کہ کیا یہ حقیقت ہے کہ جنرل بھیلر کی لڑکی نے چار پانچ باغیوں کو اپنی پستول کا نشانہ بنا ڈالا تھا اور خود عصمت دری کے خوف سے ایک کنوئیں میں کود گئی تھی" یہ سن کر محمد علی مسکرا دیا اور کہا:

" یہ بات تو بالکل غلط ہے۔ مس بھیلر تو اب بھی زندہ ہے اور لکھنؤ کے ایک زنان خانے کی زینت بنی ہوئی ہے۔ اس نے مسلمان ہو کر ایک مسلم نوجوان سے شادی کر لی ہے۔ وہ کہاں ہے اور اس کا شوہر کہاں ہے میں نہیں جانتا (یا اس نے بتانے سے انکار کر دیا ہو)"

اس کو انگریزوں نے پھانسی کی سزا دے کر پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ وہ مہینہ جولائی ۱۸۵۷ء کا تھا۔

مشہور مجاہد جنگ آزادی

مولوی احمد اللہ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہار جانے کے بعد ملک پوری طرح سے انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ وہابی جو بہت پہلے سے ہندوستان میں حکمرانی کے خواب دیکھ رہے تھے وہ بھی کافور ہو چکے تھے لیکن انگریزوں کو ملک بدر کر دینے کی جنگ ان کی ابھی جاری تھی۔ انگریزوں کے خلاف سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تھا اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ناکامیاب ہو جانے کے بعد بھی انگریزوں کو ملک بدر کرنے کے لئے کوشاں رہے تھے۔ وہابیوں نے تو اپنا ایک بڑا مضبوط مرکز افغانستان کے ایک پہاڑی مقام "ستانا" میں بنا رکھا تھا جو ملک کو مکمل آزادی حاصل ہو جانے کے بعد ہی ختم ہوا تھا اور انہوں نے اسی مرکز سے انگریزوں کے ساتھ لڑائیاں بھی لڑی تھیں۔ مولوی احمد اللہ وہابیوں کے خاص لیڈر تھے اور ان کی مالی امداد سے ستانا کا مرکز چل رہا تھا۔ اس باغی چھاؤنی کے آخری لیڈر مجاہد مولوی فضل الٰہی خیر آبادی تھے۔ کسی وقت یہاں ۴۰۰۰ ہزار تک ہندو مسلمان مجاہدین جنگ آزادی پناہ گزین تھے۔ وہابی تحریک عرب میں عبدالوہاب نے شروع کی تھی۔ مکہ جانے والے ہندوستان کے مسلمان اس تحریک کو اپنے ساتھ لے آئے کیونکہ یہ ایک مذہبی تحریک تھی۔ رائے بریلی کے سید احمد شاہ اور دہلی کے مولانا شاہ ولی اللہ نے ہندوستان میں اس تحریک کو بہت فروغ دیا۔ ان کا خاص مرکز پٹنہ میں تھا ۱۸۲۳ء میں وہابیوں نے پشاور پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس سے ان کی عظمت کو چار چاند لگ گئے تھے۔

مولوی احمد اللہ انہیں سید احمد شاہ کے جانشین تھے انہوں نے ہی ۱۸۶۳ء میں ستانا کا باغی مرکز قائم کیا تھا بہار کے داؤد

میاں نے اس مذہبی تحریک کو انقلابی رنگ دیا اور اسے شہر دلے سے گاؤں میں پہونچایا۔ وہ مسلم گاؤں میں کام کرتے تھے اور زمینداروں کی مخالفت کرتے تھے جو انگریز پرست تھے دھیرے دھیرے وہابی مذہبی تحریک سیاسی تحریک میں بدل گئی مولوی احمد اللہ صادق پور (پٹنہ) کے رہنے والے تھے ان کا خاندان دنیاوی اور علمی دولت سے مالامال تھا۔ قرب وجوار میں اس خاندان کی بڑی عزت تھی اور اثر تھا صادق پور بہت جلد باغیوں کا مرکز بن گیا۔ انگریز مولوی احمد اللہ کو حکومت کے لئے بہت خطرناک سمجھتے تھے اور انھیں گرفتار کرلینا چاہتے تھے مگر گرفتاری کے لئے ان کے پاس کوئی بہانہ نہ تھا

۱۸۵۲ء میں مولوی صاحب نے راول پنڈی کی چھاؤنی کے منشی محمد ولی کو کچھ خط لکھے جو اتفاق سے پکڑے گئے۔ بس مولوی صاحب کے خلاف انگریزوں کو بغاوت کرنے کا ثبوت مل گیا۔ مگر ان کے اثر کو دیکھتے ہوئے انگریزوں کی ہمت انھیں گرفتار کرنے کی نہ ہوئی۔ جب ۱۸۵۷ء کا غدر پٹنہ میں بھی ہوگیا تو پٹنہ کے کمشنر ٹیلر نے امن وامان پر مشورہ کرنے کے بہانے انھیں اور کچھ دیگر معزز اشخاص کو اپنے بنگلے پر بلایا اور دھوکا دیکر گرفتار کرلیا تھا اور نظر بند کر دیا گیا تھا۔

پٹنہ میں بغاوت ہوگئی تھی۔ ۳۰ آدمیوں کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ پیر علی کو ۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو پھانسی دی گئی تھی جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اسی دن دوسرے سات باغیوں کو بھی پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ پھانسی پانے والوں میں وارث علی نام کا ایک پولس انسپکٹر بھی تھا وہ بھی باغی ہوگیا تھا۔ نظر بندی سے چھوٹ جانے کے بعد بھی مولوی احمد اللہ خاموش نہیں رہے تھے۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۸ء اور ۱۸۶۳ء کی تین لڑائیوں میں حصہ لیا تھا۔ آخر ۱۸۶۵ء میں انھیں گرفتار کرلیا گیا مقدمہ میں مولوی احمد اللہ کے ایک مختار الٰہی بخش کو لالچ دیا جو اس وقت قید میں تھا۔ اس نامعقول نے اپنے آقا کے خلاف ڈٹ کر گواہی دی تھی۔ مولوی

صاحب کو حبس دوام کی سزا ملی۔ انہیں انڈمان بھیج دیا گیا۔ انکی تمام جائیداد ضبط کر کے نیلام پر چڑھادی گئی تو کوئی بولی بولنے والا نہ ملا۔ انگریزوں نے اپنے آدمی بولی بولنے کے لئے تیار کئے تھے۔ مولوی صاحب کے بھائی مولوی یحییٰ علی کو پہلے ہی سرکار قید کر چکی تھی۔ انہیں کیساتھ غدار الٰہی بخش بھی قید کاٹ رہا تھا جسنے بعد کو نمک حرامی کی تھی۔

مولوی احمد اللہ پر بہت سے الزام لگائے گئے تھے اور انہیں باغیوں کا سردار قرار دیا تھا جو حقیقت تھی۔ عدالت سے تو مولوی صاحب کو پھانسی کا ہی حکم ہوا تھا جو ہائی کورٹ میں اپیل کرنے کے بعد کالے پانی کی سزا میں بدل گیا۔ ان کے کتب خانے کو برباد کر دیا گیا تھا۔

شہید عبداللہ

مولوی احمد اللہ کی گرفتاری کے بعد اور بھی کئی مقدمے باغیوں پر چلائے گئے تھے۔ انگریزی سرکار تو باغیوں کی بیخ کنی پر تلی ہوئی تھی لوگوں کو سزائیں بہت سخت دی جاتی تھیں۔ بنگال کا چیف جسٹس جان نبسٹن تو بہت بے رحم تھا۔ اس لئے عبداللہ بہاری نے اسے ہی ختم کر دینے کا بیڑا اٹھایا اور ۲۰ ستمبر ۱۸۷۱ء کو جب جج صاحب کورٹ کی سیڑھیاں اتر رہے تھے، تو اس نے انہیں موت کے گھر پہونچا دیا۔ بعد میں عبداللہ کو پھانسی کی سزا ملی تھی۔

مشہور مجاہد جنگ آزادی امیر خاں

۱۸۶۹ء میں ۲۱ بہاریوں پر انگلستان کی رانی وکٹوریہ کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلا تھا۔ انہیں میں کو دو ٹولہ کے امیر خاں

بھی شامل تھے۔ مقدمے کی پیروی کے لئے بمبئی سے بیرسٹر انسینٹ کو بلایا گیا تھا۔ پٹنہ کے سیشن جج نے امیر خاں کو حبس دوام کی سزا دی تھی۔ امیر خاں مولوی احمد اللہ کے خاص مریدوں میں تھے، اور بہت عزت دار بھی تھے۔ وہ بھی انڈومان جاکر اپنے پیرومرشد کے قریب پہونچ گئے تھے۔

جنگِ آزادی کا مشہور شہید شیر علی

سرحدی صوبہ کا پٹھان وہابی شیر علی نام کا ہی شیر نہیں تھا۔ وہ اپنے کام کے لحاظ سے بھی شیر تھا۔ انگریزی حکومت کے مظالم سے وہ خوب واقف تھا۔ وہ انگریزوں کو سبق سکھانا چاہتا تھا، اور ان سے بدلہ لینے کے لئے بیتاب تھا۔ اتفاقاً حکومت کے افسر اعلیٰ لارڈ میو صاحب فروری ۱۸۷۲؁ء میں انڈومان تشریف لائے۔ جیل کے قیدیوں کے علاوہ سرکاری ملازمین نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ شیر علی بھی ان کا خیر مقدم کرنے والوں میں شامل ہوا، لیکن اس کا خیر مقدم انقلابی تھا۔ جس وقت وائسرائے لارڈ میو صاحب دخانی کشتی پر سوار ہو رہے تھے۔ شیر علی ایک شیر کی طرح ان پر جھپٹا اور اپنے چھرے سے اس کا کام تمام کر دیا۔ صاحب بہادر کو بجائے ہندوستان کے سیدھا جہنم پہونچا دیا۔

بہادر وہابی شیر علی کو وہیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

لارڈ میو کے روانہ ہونے کی تاریخ ۸ر فروری ۱۸۷۲؁ء تھی۔

مولوی احمد اللہ انڈومان میں بھی خاموش نہیں رہے تھے۔ انڈومان سے وہ اپنی سرحدی صوبہ کی باغی فوجی چھاؤنی کو چلا رہے تھے۔ اس چھاؤنی کے سربراہ مولوی فضل الٰہی وزیر آبادی کا انتقال ۱۹۵۰؁ء میں ہوا تھا۔

مشہور مجاہدِ جنگِ آزادی مولوی برکت اللہ

مولوی برکت اللہ ریاست بھوپال کے رہنے والے تھے۔ ان دنوں ریاستوں کا حال بہت خستہ تھا۔ مولوی صاحب نے جب تعلیم سے فرصت پائی تو وہ ۱۹۰۹ء میں جاپان چلے گئے۔ وہ جاپان کے ٹوکیو یونیورسٹی میں ماسٹر ہو گئے۔ یہاں سے انہوں نے "نیا اسلام" نام کا ایک رسالہ بھی شائع کرنا شروع کیا جو مقبول ہوا۔ وطن پرستی کا جذبہ برکت اللہ میں پیدائشی تھا۔ آزاد ملک میں رہنے سے آزادی اور غلامی کا فرق بھی ان پر واضح ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ امریکہ چلے گئے۔ کیونکہ مادرِ وطن کی آزادی کے لئے وہ بھی کچھ کرنا چاہتے تھے۔ امریکہ میں ان کی ملاقات غدر پارٹی والوں سے ہو گئی۔ امریکہ میں غدر پارٹی کی بنیاد ۱۹۱۳ء سے شروع ہو چکی تھی۔ وہ غدر کے نام سے کئی رسالے شائع کرتی تھی۔ ایک رسالہ اردو میں بھی نکلتا تھا۔ مولوی برکت اللہ اسی کے لئے کام کرنے لگے۔ وہ غدر پارٹی کے نائب صدر منتخب ہو گئے تھے۔ اب ۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہو گئی تھی۔ مولوی برکت اللہ کی مغربی ممالک میں ہندوستان کی آزادی کے لئے کام کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ انہوں نے مغربی ممالک کا خوب دورہ کیا اور ہندوستان کی آزادی کے لئے ہمدردوں کی تلاش کیلئے انہیں بھیجا گیا تھا۔

مولوی برکت اللہ نے جرمنی، انگلینڈ اور ترکی وغیرہ ملکوں کی سیاحت کی۔ انگلینڈ میں ان کی ملاقات مشہور انقلابی شیام جی کرشن ورما سے ہوئی، اور دوسرے کچھ انقلابیوں سے ہوئی۔ تو ان پر انقلاب کا رنگ کچھ اور گہرا چڑھ گیا۔ ان تمام آزاد ممالک کا دورہ کر کے وہ پکے انقلابی بن گئے تھے۔ جرمنی اور ترکی جیسے آزاد ممالک کے ساتھ انہوں نے

ربط ضبط بھی قائم کر لیا تھا۔ جب وہ افغانستان آئے تو ان کی ملاقات راجہ مہندر پرتاپ سے ہو گئی۔ وہ بھی اپنا وطن متھرا چھوڑ کر بیرونی ممالک میں وطن کی آزادی کے لئے کام کر رہے تھے۔ یہ دونوں اپنے وطن کی آزادی کے دیوانے تھے اور خوب نبھے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔

ان دونوں نے کچھ دوسرے انقلابیوں سے مل کر آزاد ہند سرکار کی افغانستان میں بنیاد ڈالی۔ اس آزاد جمہوریہ کے صدر، راجہ مہندر پرتاپ بنائے گئے۔ اور وزیر اعلیٰ مولوی برکت اللہ ہی ہوتے تھے۔ جرمن، ترکستان اور افغانستان وغیرہ ممالک نے اسے منظور بھی کر لیا تھا۔ مگر ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں جرمنی کو جب شکست ملی تو یہ عارضی سرکار بھی ختم ہو گئی۔ وہ امریکہ چلے گئے اور وہیں ۱۹۲۷ء میں کیلی فورنیا میں بڑی غربت کی حالت میں فوت ہو گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مولوی برکت اللہ کا انتقال ۵ رجنوری ۱۹۲۸ء کو جرمنی میں ہوا تھا۔ زندگی میں کبھی ان کے دل کو سکون حاصل نہ ہوا۔ اللہ ان کی روح کو سکون عطا فرمائے۔ آمین۔

مشہور مجاہد جنگِ آزادی اور شہید رحمت علی

شہید رحمت علی موضع ہلو اسیا ضلع لدھیانہ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ کچھ تعلیم حاصل کر کے وہ فوج میں بھرتی ہو گئے تھے ان کو ملایا کا ایسٹ گارڈ کا کام دیا گیا۔ ان کی فوج سنگاپور بھیج دی گئی تھی۔ یہ زمانہ پہلی جنگ عظیم کا تھا۔ امریکہ میں مقیم ہندوستانی غدر پارٹی ہندوستان میں غدر کرا کر انگریزی حکومت کا تختہ پلٹ دینا چاہتی تھی۔ غدر پارٹی کے آدمی جگہ جگہ گھوم رہے تھے اور ہندوستان میں آزادی کے لئے کام کر رہے تھے۔ سرکاری فوجوں

کو بغاوت کے لئے آمادہ کر رہے تھے۔ انہوں نے رحمت علی سے بھی رابطہ قائم کیا۔ انہوں نے رحمت علی کے دماغ میں یہ بات بٹھادی کہ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کا یہی موزوں وقت ہے۔ اس وقت انگریز بری طرح سے لڑائی میں پھنسے ہوئے ہیں۔

رحمت علی فطری طور پر وطن پرست تھے۔ وہ بغاوت کے لئے تیار ہو گئے اور اپنے چند ساتھیوں کو بھی تیار کر لیا، اور پھر ایک دن وہ بھی آیا جب انہوں نے وطن پرستی کا ثبوت دیا اور انگریزوں سے بغاوت کر دی۔ ہندوستان میں انقلابی لیڈران نے بغاوت کی تاریخ ۲۱ر فروری ۱۹۱۵ء مقرر کی تھی۔ جب پنجاب کے غدار کرپال سنگھ نے اس تاریخ سے اپنے انگریز آقاؤں کو خبردار کر دیا تو یہ تاریخ بدل کر ۱۹ر فروری کر دی گئی جس کی خبر رحمت علی تک نہیں پہونچ سکی اور انہوں نے ۲۱ر فروری ۱۹۱۵ء کو ہی اپنی فوج میں بغاوت کی۔ رحمت علی اس وقت حوالدار کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ فوجی افسران نے بغاوت دبا دی اور باغیوں کو گرفتار کر لیا۔ رحمت علی کا اور کچھ دوسرے سپاہیوں کا کورٹ مارشل ہو گیا۔ سازش کرنے، دیگر سپاہیوں کو بغاوت کی ترغیب دینے کے جرم میں ان پر اور ان کے چار اور مسلمان ساتھیوں پر مقدمہ چلا اور سب کو موت کی سزا سنائی گئی۔ ان سب کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) رحمت علی (۲) عبدالغنی (۳) صوبے دار داؤد خاں (۴) جمعدار چشتی خاں (۵) سپاہی حاکم علی۔

۲۳ر مارچ ۱۹۱۵ء کو ان پانچوں کو قتل گاہ لیجایا گیا۔ ان کو ایک قطار میں مرنے کے لئے کھڑا کر دیا گیا اور رسمی طور پر ان کو ان کا جرم اور سزا سنائی گئی۔ اس کے بعد ان کے ہاتھ ان کی پیٹھ پر باندھ دیئے گئے، اور ان سے کہا گیا بس اب موت کا

اِستقلال کیجئے۔

فوجی صاحب نے اشارہ کیا تو پانچ بندوقیں ایک ساتھ دھائیں دھائیں کر اٹھی اور پانچ وطن پرست شہیدوں کے جسم زمین پر تڑپنے لگے۔

شہید رسول اللہ، امتیاز علی

۱۹۱۴ء کی عالمی جنگ ۴ اگست کو شروع ہوئی تھی۔ اور وہ ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی۔ اس عرصے میں ملک کے انقلابیوں نے ملک کو آزاد کرانے کی بہت کوشش کی تھی۔ اس کے لئے بہت بڑی تیاری کی گئی تھی۔ جرمنی سے رابطہ قائم کر کے خاصی تعداد میں ہتھیار لگائے گئے تھے۔ کئی مقامات پر بم تیار کئے جا رہے تھے۔ بغاوت کے لئے فوجوں کو تیار کیا جا رہا تھا۔ بڑے جوکھم کے کام ہو رہے تھے۔ ہندوستان میں غدر کر دینے کی تاریخ بھی ۲۱ فروری ۱۹۱۵ء مقرر ہو چکی تھی۔ امریکہ کے سان فرانسسکو میں مقیم ہندوستان کی غدر پارٹی ہندوستان میں غدر کرانے کی تجویز پر عمل کر رہی تھی۔ یہ کام وطن کے سرفروش ہی کر سکتے تھے۔ اور اس موقع پر ہم وطن کے ان تین مسلمان شہیدوں کو یاد کر لیں۔ جنہوں نے اپنے پیارے وطن سے دور وطن کی آزادی کے لئے جان قربان کر دی تھی۔ مگر دفن ہونے کے لئے انہیں وطن کی دو گز زمین بھی نہ ملی تھی۔

وطن کے ان شہیدوں کے نام ہیں۔ (۱) رسول اللہ (۲) امتیاز علی (۳) رکن الدین۔ یہ تینوں پانچویں لائٹ بٹالین کے بہادر سپاہی تھے انہیں صرف یہ معلوم تھا کہ بغاوت کی تاریخ ۲۱ فروری ۱۹۱۵ء مقرر ہو چکی ہے اور یہ نہ معلوم ہو سکا تھا۔ اس تاریخ کو بدل کر ۱۹ فروری کر دیا گیا کیونکہ پنجاب کے غدار کرپال سنگھ نے جو سرکاری جاسوس

تھا اور چالاکیوں سے انقلابیوں میں آملا تھا۔ سرکار کو سب راز افشاں کر دیا تھا۔ اس لیے ۲۱ رکی جگہ ۱۹ رفروری کر دی گئی اور سرکار کو یہ تاریخ بھی معلوم ہو گئی تھی۔ دور دراز کے علاقوں میں جو ہندوستان سے باہر تھے وہاں بدلی ہوئی تاریخ کی خبر نہ پہنچائی جا سکی تھی۔ اس لیے وہاں کے فوجیوں نے ۲۱ رفروری کو ہی بغاوت کر دی تھی۔

غدر شروع کر دیئے جانے پر دو فوجی انگریز افسروں کو اسی دن گولی مار دی گئی اور باقاعدہ بغاوت کر دی۔ ملایا کی پانچویں رجمنٹ میں اس وقت ۹۰۰ سپاہی تھے۔ باغی سپاہیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کا کورٹ مارشل ہوا اور انہیں موت کی سزا دی گئی۔ یہ بھی حکم ہوا کہ انہیں یکم مارچ ۱۹۱۵ء کو گولی سے اڑا دیا جائے۔

ان دنوں پھانسی دیکھنے کے لیے سرکار بھیڑ کو دعوت دیتی تھی تاکہ بغاوت کا کوئی نام نہ لے۔ ان تینوں جانبازوں کو سنگاپور کے قتل گاہ پر لے جایا گیا۔ پشت پر ان کے ہاتھ باندھ دیئے گئے۔ ایک قطار میں انہیں کھڑا کیا گیا۔ افسر کا اشارہ ہوا۔ "ڈھائیں ڈھائیں" کی آواز ہوئی اور تین جسم زمین پر لوٹنے لگے۔ ان تینوں کی قربانی بیکار نہیں گئی۔ ہندوستان کی آزادی کا محل انہیں شہیدوں کے خون اور ہڈیوں پر کھڑا ہے۔

شہید سلیمان، منشی خان، ظفر علی خاں اور عبدالرزاق

یہ چاروں مسلمان وطن پرست تھے۔ انگریزی فوج جو سنگاپور میں مقیم تھی اس میں یہ لوگ حوالدار، نائیک اور لینس نائیک کے عہدوں پر فائز تھے۔ ان کی کمپنی پانچویں لائٹ انفنٹری تھی۔ یہ چاروں بھی ۲۱ رفروری ۱۹۱۵ء میں ہونے والی بغاوت

کے لئے دل و جان سے تیار تھے۔ انہیں بھی انقلاب کے لئے بدلی ہوئی تاریخ کا کچھ پتہ تک نہ تھا۔ لہٰذا وہ لوگ بھی اپنی رجمنٹ میں ۲۱ ر فروری کو بغاوت کر دینے کے لئے کمربستہ تھے۔ ان کے کچھ ساتھی بھی الگ الگ پکڑے جا چکے تھے اور جنہیں مختلف تاریخوں میں سزائے موت دی جا چکی تھی۔

ان چاروں نے بھی جب سرکاری حکم ماننے سے انکار کر دیا تو انہیں باغی قرار دیا گیا۔ ان پر بھی حکم عدولی کا مقدمہ چلا، اور فوجی کورٹ نے ان چاروں کو بھی موت کی سزا سنا دی۔ فوج میں حکم عدولی کو بہت بڑا قصور مانا جاتا ہے اور اس کے لئے موت کی سزا تک دی جاتی ہے۔ ان چاروں وطن پرستوں نے معافی کا کوئی اظہار نہیں کیا اور نہ اپنی جاں بخشی کے لئے منت سماجت ہی کی تھی۔

ان دنوں آج کی طرح بند جگہوں میں پھانسی نہیں دی جاتی تھی۔ انگریز حاکم باغیوں کو کھلے میدان میں پھانسی دیتے تھے اور تماشائیوں کا بھی مجمع لگا لیتے تھے۔ اس مجمع کے سامنے باغیوں کو ان کا قصور اور اس کے عوض میں ملنے والی سزا کو پڑھ کر سنایا جاتا تھا تاکہ لوگوں کے دلوں میں انگریزوں کا رعب و خوف بیٹھ جائے۔ ان کے لئے پھانسی کی سزا کے لئے ۲۸ ر مارچ ۱۹۱۵ء کی تاریخ طے کی گئی تھی۔

منحوس تاریخ والے دن ان چاروں کو سنگاپور کی جیل سے باہر میدان میں لایا گیا۔ اور ان کے دونوں ہاتھ ان کی پشت پر باندھ گئے اور ان کو پھر ایک قطار میں کھڑا کیا گیا۔ ان کے قطار میں کھڑا ہو جانے کے بعد انہیں ان کا فردِ جرم پڑھ کر سنایا گیا اور چار جلاد سپاہیوں کے ہاتھوں میں بندوقیں دے کر پہلے سے ہی پوری تیاری کی حالت میں کھڑا کر دیا گیا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ وہ صاحب کے رومال ہلانے کا اور بدبخت گولی کھانے کا انتظار کریں — فوجی

افسر نے اپنا رومال ہلایا تو ان جلاد سپاہیوں نے دعائیں دعائیں کی آواز کے ساتھ ایک منٹ میں چار لاشیں زمین پر ڈھیر ہو گئیں۔

شہید سید رحمت علی شاہ

آپ بھی ہندوستان چھوڑ کر روزی روٹی کی تلاش میں امریکہ چلے گئے تھے۔ امریکہ کے شہر سان فرانسسکو کی غدر پارٹی میں شریک ہو گئے۔ غدر پارٹی میں اور بہت سے مسلمان کام کرتے تھے۔ غدر پارٹی ایک رسالہ اردو میں بھی شائع کرتی تھی۔ رحمت علی نے بھی کچھ دن یہاں کام کیا۔ غدر پارٹی ہندوستان میں انقلاب برپا کر کے انگریزوں کے ہاتھ سے حکومت چھین لینا چاہتی تھی۔

اس پارٹی میں جو دوسرے مسلمان کام کرتے تھے ان کے نام یہ ہیں
(۱) محمد بشیر (۲) خدا بخش (۳) احمد زکریا (۴) ظفر حسین
(۵) اللہ نوازنہ (۶) عبد العزیز

جب ۱۹۱۴ء کی عالمی جنگ شروع ہوئی تو رحمت علی کو جو کام سپرد کیا گیا وہ بہت خطرناک تھا۔ انہیں یورپ کے دیگر ممالک میں ہندوستان کی آزادی کے لئے اور انگریزی فوج میں بغاوت کرانے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ کیونکہ وہ بھروسے کے آدمی تھے اور ہوشیار بھی تھے۔ انہوں نے اپنے کام کو بخوبی انجام دیا تھا۔ مگر انگریز جاسوسوں کی تیز نظروں سے وہ بھی نہ بچ سکے تھے اور جاسوسی کے الزام میں ان کو بھی پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ ان کے دیگر ساتھیوں کا بھی یہی حشر ہوا ہوگا۔

کاش ہم اس جوشیلے شہید کے بارے میں اور کچھ زیادہ معلومات فراہم کر سکتے۔

شاہ رحمت علی کی روح کو خدا اپنی رحمت میں پناہ دے۔

مشہور مجاہدِ جنگِ آزادی ڈاکٹر سیف الدین کچلو

یہ پنجاب کے بڑے مشہور بیرسٹر تھے۔ یہ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۶۳ء میں ہوا۔ مہاتما گاندھی کے دوستوں میں تھے۔ ۱۹۱۹ء میں جب پنجاب میں مارشل لاء نافذ کیا گیا تو انہوں نے اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ بطور بیرسٹر کے انہوں نے دہلی اور میرٹھ میں چلائے جانے والے ہندوستانیوں کے خلاف سازشی کیسوں کی پیروی کی تھی۔ خلافت تحریک کے بھی آپ ایک لیڈر تھے۔ آل انڈیا امن کمیٹی کے آپ صدر تھے۔ عالمی امن کمیٹی کے بھی آپ نائب صدر تھے۔ عالمی جنگ ختم ہو جانے کے بعد جب انگریز حکومت نے رولٹ ایکٹ کا کالا قانون پاس کیا تو ڈاکٹر اور بیرسٹر کچلو نے اس کی زوردار مخالفت کی تھی اور شمالی ہندوستان کا دورہ کر کے ملک کو بیدار کیا تھا اور انہیں انگریزوں سے ہونے والی بے انصافیوں سے آگاہ کیا تھا۔ سرکار انگلیشیہ نے ان پر پابندیاں لگا دی تھیں۔

۱۰ر اپریل ۱۹۱۹ء کو پنجاب کے گورنر اوڈائر نے انہیں اور ڈاکٹر ستیہ پال کو اپنی کوٹھی پر صلاح و مشورہ کے لئے مدعو کیا تھا اور جب یہ لوگ وہاں تشریف لے گئے تو اسی کمینے نے ان کو گرفتار کر لیا، فوجی گاڑی میں بٹھا کر انہیں دھرم شالہ میں نظر بند کیا گیا۔ ان دو سر کردہ لیڈروں کی اور بعد میں مہاتما گاندھی کی گرفتاری پر پنجاب کی پبلک نے بڑا احتجاج کیا۔ ہڑتالیں ہوئیں اور جلوس نکالے گئے۔ امرتسر کے جلیان والا باغ میں ان لیڈران کی گرفتاری کے اور رولٹ ایکٹ کے خلاف ۱۳ر اپریل ۱۹۱۹ء کو جلسہ منعقد کیا گیا۔

جلیان والا باغ پنجاب کے مسلمان شہید

وہ منحوس تاریخ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کی تھی۔ جس دن لیڈروں اور رولٹ ایکٹ کے خلاف پنجاب کے کئی ہزار ہندو اور مسلمان امرت سر کے جلیان والا باغ میں جلسہ کر رہے تھے۔ ابھی ایک صاحب تقریر کرنے کے لئے اٹھ کر چند الفاظ ہی کہہ سکے تھے کہ جنرل ڈائر نے جس نے باغ کے پھاٹک پر مشین گنیں لگا رکھی تھیں۔ گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ تڑاتڑ گولیاں چلنے لگیں اور لوگ چیخنے لگے۔ اس مجمع میں بوڑھے۔ جوان۔ مرد۔ عورت، اور بچے بھی تھے۔ اس بے رحم نے کسی پر رحم نہ کیا اور تھوڑی ہی دیر میں جلیان والا باغ کربلا بن گیا۔ اس کم بخت نے پیاسوں کو پانی تک نہ پینے دیا تھا۔ مقتول ایک ایک بوند پانی کے لئے دم توڑ رہے تھے۔ جلیان والا باغ کوئی باغ نہیں ہے۔ یہ تو کچھ مکانوں سے گھرا ہوا ایک میدان ہے۔ جس میں جلسے اور میٹنگیں وغیرہ ہوا کرتی ہیں۔ باہر جانے کے لئے ایک ہی پھاٹک تھا۔ جس پر منحوس ڈائر نے مشین گنیں فٹ کرا دی تھیں۔ وہ اس وقت تک ہجوم پر گولیاں چلاتا رہا جب تک اس کی گولیاں ختم نہیں ہو گئیں۔ ڈائر کے اس ظلم سے ہندوستان کراہ اٹھا تھا۔

ہم صرف مسلمان شہیدوں کے ہی نام دے رہے ہیں جن کے نام تاریخ میں ملتے ہیں۔

(۱) عبدالکریم ولد لال محمد ۱۹۰۲ء میں امرت سر پنجاب میں پیدا ہوئے تھے۔

(۲) عبدالخالق ولد رحیم خاں امرت سر پنجاب میں ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ روئی بیلنے کے ایک کارخانے میں مزدوری

کرتے تھے۔

(۳) عبدالمجید ولد رحیم بخش یہ شمالی مغربی صوبہ کے رہنے والے تھے۔ یہ حصہ اب پاکستان میں چلا گیا ہے۔

(۴) عبدالمجید ولد بودھ کہار یہ شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے رہنے والے تھے۔

(۵) عبدالمجید یہ ایک جوشیلے طالب علم اتر پردیش کے رہنے والے تھے اور ان کو شروع سے ہی سیاست سے دلچسپی تھی۔

(۶) عبدلیا۔ یہ امرتسر پنجاب میں پیدا ہوئے تھے اور دھوبی کا کام کرتے تھے۔

(۷) عبداللہ ولد لال محمد امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔

(۸) احمد دین۔ یہ ۱۸۸۵ء میں گجران والا (پنجاب) میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ گوالا تھے۔ یہ حصہ اب پاکستان میں ہے۔

(۹) احمد دین ولد کریم بخش امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔

(۱۰) احمد دین ولد دینا۔ امرتسر پنجاب میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ برتن بناتے تھے۔

(۱۱) احمد خاں ولد وارے خاں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔

(۱۲) احمد اللہ ولد کریم بخش امرتسر کے رہنے والے تھے۔

(۱۳) اللہ بخش، یہ لاہور میں ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے تھے، اور لوہاری کا کام کرتے تھے۔

(۱۴) اللہ دتا ولد میگھا، امرتسر میں ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے تھے

(۱۵) برکت ولد بھولا شیخ۔ یہ ۱۸۹۹ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔

(۱۶) برکت علی ولد الٰہی بخش۔ یہ امرتسر میں ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔

(۱۷) نظام الدین یہ ۱۹۰۱ء میں ماشو باشی کھوگیلا گاؤں ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام لبی گذار تھا۔ یہ

مزدوری کرتے تھے۔

(۱۸) چراغ دین۔ یہ ۱۹۰۱ء میں کوٹ مراد خاں نامی گاؤں ضلع لاہور (پنجاب) میں پیدا ہوا تھا۔ ان کے والد کا نام محمد بخش تھا۔

(۱۹) گیہرو گوجر۔ یہ امرتسر میں ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ صابن فیکٹری میں ملازم تھے۔

(۲۰) فتح محمد ولد عطا محمد ۱۸۹۵ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ رنگ ساز تھے۔

(۲۱) فضل ولد مولا بخش یہ ۱۹۰۴ء میں گجرانوالا (پنجاب) میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ کسان تھے۔

(۲۲) حامد ولد احمد دین کاشمیری یہ ۱۸۹۵ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔

(۲۳) حسن محمد ولد فضل دین ارین یہ ۱۹۰۱ء میں گجرانوالا (پنجاب) میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں رہتے تھے۔

(۲۴) حاستی ولد سکندر۔ امرتسر میں رہتے تھے اور سناری کا کام کرتے تھے۔

(۲۵) ابراہیم ولد امام دین۔ ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے تھے اور ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے۔

(۲۶) علم الدین۔ موضع موکند ضلع امرتسر میں پیدا ہوئے تھے یہ پرائیویٹ نوکر تھے۔

(۲۷) امام الدین۔ یہ ۱۸۷۹ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام مراد بخش تھا۔ یہ لوہار تھے۔

(۲۸) اسمٰعیل۔ یہ ۱۸۸۶ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ والد میر بخش تھے۔ یہ سناری کا کام کرتے تھے۔

(۲۹) اسمٰعیل۔ ان کی پیدائش ۱۹۰۵ء کی ہے۔ یہ گجرانوالہ (پنجاب) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام نظام الدین تھا۔

(۳۰) کریم بخش یہ ۱۸۹۶ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ گھڑی ساز تھے۔

(۳۱) خدا بخش ان کے والد کا نام بسن شاہ فقیر تھا۔ یہ ۱۸۹۲ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔

(۳۲) میرا بخش ولد نکا کاشمیری۔ یہ ۱۸۸۶ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔

(۳۳) محمد الدین یہ ۱۸۹۲ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام کریم بخش تھا۔ یہ سناری کا کام کرتے تھے۔

(۳۴) محمد اسمٰعیل یہ بچہ ہی تھا۔ اس کا جنم امرتسر میں ۱۹۱۲ء میں ہوا تھا۔ اس کے والد کا نام کالو کاشمیری تھا۔

(۳۵) محمد صدیق۔ یہ ۱۸۹۴ء میں امرت سر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام مراد بخش تھا۔

(۳۶) محمد شفیع۔ یہ ۱۸۸۹ء میں گاؤں ننگر جعفر اول ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام امین محمد تھا۔ یہ دکان دار تھے۔ یہ بھی اس دن اپنی دکان بند کر کے جلیان والا باغ گئے تھے اور وہیں شہید ہو گئے۔

(۳۷) محمد شریف۔ ان کی پیدائش امرتسر میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام محمد رمضان تھا۔

(۳۸) نور محمد یہ ۱۸۶۶ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام بوٹا عریشہ تھا۔ یہ مزدور تھے۔

(۳۹) نور محمد۔ یہ ۱۸۹۴ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام جھنڈا تھا۔ یہ تیل بیچنے کا کام کرتے تھے۔

(۴۰) رمضان۔ یہ ۱۸۸۴ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ ایک فیکٹری میں کام کرتے تھے۔

(۴۱) رسول - یہ امرتسر کے چھبل کالا گاؤں میں ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے تھے - اس کے والد کا نام چندا تھا اور وہ دھوبی تھا -

(۴۲) رحمت - یہ ۱۸۹۸ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے - والد نواب دی شیخ تھے -

(۴۳) رکن الدین - یہ ۱۹۰۱ء میں موضع تھاڈا ضلع امرتسر میں پیدا ہوئے تھے - ان کے والد کا نام الہٰی بخش تھے -

(۴۴) شمس الدین - یہ ۱۸۹۵ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے ان کے والد کا نام سکندر تھا -

(۴۵) شرف الدین - یہ ۱۹۰۰ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے ان کے والد کا نام جمال الدین تھا -

(۴۶) وارث - یہ ۱۸۹۳ء میں گاؤں پنڈدون ضلع جہلم میں پیدا ہوئے تھے -

(۴۷) وارث - ان کی پیدائش ۱۸۸۹ء کی ہے - یہ امرتسر میں پیدا ہوئے تھے - ان کے والد کا نام چراغ الدین تھا -

(۴۸) محمد بخش - یہ بھی امرتسر میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے تھے -

(۴۹) مولا - یہ درزی تھے اور امرتسر میں پیدا ہوئے تھے -

یہ فہرست مکمل نہیں ہے - اس میں صرف وہی نام درج کئے گئے ہیں - جو معلوم ہو سکے تھے - بہت سے گمنام شہید بھی تھے یہ شہید ۱۳ اپریل کے ہیں - اس کے بعد بھی شہادت کا سلسلہ جاری رہا تھا - جلیانوالا باغ کے قتل عام کے بعد انگریزوں نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی تھی - گلیوں اور سڑکوں پر انہیں پیٹ کے بل رینگنے کے لئے مجبور کیا گیا تھا - انہیں کوڑے لگائے جاتے تھے - کبھی مرغا بنائے جاتے تھے - اکثر درخت سے باندھ کر بیت لگائے جاتے تھے - اکثر ان کے پیٹ میں سنگینیں بھونک دی جاتی تھیں - گھروں میں گھس کر

عورتوں کو بے عزت کیا جاتا تھا۔ ۲۱۹ مجاہدوں کو عدالتوں میں جانا پڑا ان میں ۱۵ آدمیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ان میں سے اور کتنے مسلمان تھے۔ کوئی صحیح تعداد نہیں بتلا سکتا۔

بقول علامہ اقبالؔ سے

ہر ذرہ چمن سے کہتی ہے خاکِ باغ
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کی بخل نہ کر اس نہال سے

جلیان والا باغ میں آزادی کے دیوانے ہندوؤں، اور مسلمانوں نے جو اپنا خون بہایا تھا۔ وہ مل کر ایک رنگ ہو کر بہا تھا اس لیے آزادی کے مسلمان بھی اتنے ہی حقدار ہیں جتنے کہ ہندو۔ اب ملی ہوئی آزادی کی حفاظت کرنا دونوں قوموں کی مشترکہ اور مساوی ذمہ داری ہے۔

مشہور مجاہد جنگِ آزادی محمد وراثت علیخاں

جناب محمد وراثت علی خاں راحت کوئی کیانی کے آبا و اجداد کیانی نسل کے تھے۔ اس لیے راحت صاحب اپنے نام کے ساتھ کیانی بھی جوڑ دیتے ہیں۔ محمد وراثت علی کا حسب و نسب دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کی والدہ کے حقیقی نانا والی خان صاحب نہایت نیک انسان تھے اور ان میں وطن پرستی کا جذبہ تھا۔ موصوف ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے پہلے دیسی رجمنٹ میرٹھ کے افسر اعلیٰ تھے۔ جب سور کی چربی لگے۔ کارتوسوں کا مذہبی مسئلہ درپیش ہوا تو انہوں نے انگریز افسروں کو سمجھایا کہ وہ لوگ چربی لگے کارتوسوں کو اسٹور میں داخل کر دیں اور انہیں کبھی ہندو مسلمان سپاہیوں کو

استعمال کے لئے نہ دیں۔ لیکن انگریز افسر کو ان کی صلاح بری لگی اور جب ان کو خود برا بھلا کہا تو ان کو برداشت نہ ہوا اور اس پر گولی چلا دی اور پھر جھگڑا شروع ہو گیا۔ لیکن بغاوت کا آغاز محض والی خان صاحب کے انگریز افسر پر گولی چلا دینے سے شروع نہیں ہو گیا تھا۔ کچھ دوسری وجوہات بھی تھیں۔ انقلاب کی پہلے سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ میرٹھ میں مقیم پچھتر رجمنٹ نے بغاوت کر دی تھی اور والی خانصاحب نے پہلے گولی چلا دی ہو۔

وراثت علی خانصاحب فطرتاً وطن پرست واقع ہوئے ہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے وہ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں ضعیف ہو چکے ہیں اور دمہ کے مریض ہیں۔ چلنے پھرنے سے بھی محتاج ہیں لیکن ان کی وطن پرستی بدستور قائم ہے۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر ہیں اور انہوں نے زیادہ تر حب الوطنی پر نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں جن کے اب تک حسب ذیل پانچ چھوٹے چھوٹے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) پیام راحت (۲) نظر فردوس (۳) مشغلہ دل (۴) نالے اور نغمے۔ (۵) نغمۂ اسیر فرہنگ۔

بہت سے متفرق اشعار بھی کہے ہیں۔ آپ کے قومی اور سیاسی کلام کا مسودہ بوقت گرفتاری بھوپال کی اسٹیٹ پولیس اٹھا لے گئی جو کبھی واپس نہ ملا۔ بطور نمونہ ہم یہاں راحت صاحب کے چند اشعار پیش کرتے ہیں جنہیں پڑھ کر قارئین کو سن رسیدہ مجاہد آزادی کے سیاسی خیالات اور حب الوطنی کا اندازہ ہو جائے گا۔

شہید اعظم بھگت سنگھ کی شہادت پر

(۱) شہیدان وطن کا سوگ تو اتنا کرے کوئی
کہ چشم شبنمی سے خون برسایا کرے کوئی

اسی طرح دلیش سیوٹ بال گنگا دھر تلک کے ذریعہ ملک میں
قانون شکنی کے موقع پر۔

(۲) سہ   ترے خیال نے آکر جو گدگدایا تھا
زباں پر قصۂ دار و رسن پھر آیا تھا

اپنے ایک ساتھی کے ستم گار سے معافی مانگ لینے پر

(۳) سہ   کیا ہمت پرواز تری ہوگئی رخصت
صیاد سے کیوں شکوۂ بے بال و پری ہے

اسی طرح الٰہ آباد نینی جیل کے ایک ساتھی کے رنجیدہ ہونے پر

(۴) سہ   قفس کی قید میں شور و فغاں کرتی ہے کیوں بلبل
یہاں پر تو ہوا کرتی ہے تکمیل شکیبائی

دورِ انگریزی حکومت میں یہ شعر کہا تھا۔

(۵)   اُلٹ دو بڑھ کے پردہ آج افرنگی سیاست کا
مٹا دو ہند سے تفریق ہندو و مسلماں کو

راحت صاحب ۱۹۱۸ء سے ہی کانگریس اور لیڈران خلافت
کی تحریک سے وابستہ رہے ہیں اور یہی حال ان کے تین بھائیوں کا تھا۔
دو بار جیل جاچکے ہیں۔ اِس وقت مقام بینڈرا ضلع بلاس پور مدھیہ
پردیش موضع صدکوٹ میں رہتے ہیں۔ آپ یکم فروری ۱۹۰۱ء میں
پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت جسم سے کمزور ہیں۔ اپنے وطن کے جوشِ
محبت میں آپ اب بھی جواں ہیں کیونکہ سہ

موقوف آرزو ہے توانائیِ حیات،
پیری شباب ہے جو تمنا جواں رہے

وطن سے والہانہ محبت پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

سہ   دل سے نکلے گی نہ مر کر بھی وطن کی الفت
میری مٹی سے بھی خوشبوئے وطن آئے گی!

وراثت علی کے تین بھائیوں کے نام یہ ہیں۔ سب سے بڑے

(۱) ریاست علی - (۲) نفاست علی - (۳) حفاظت علی
چھوٹے۔ تینوں بھائیوں کے دلوں میں وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر
بھری ہوئی ہے۔ ان کی ایک بہن بھی ہے۔

مشہور مجاہد جنگ آزادی مولانا احمد اللہ عظیم آبادی

مولوی عبدالرحیم صادق پوری، مولانا فضل حق خیر آبادی،
مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مفتی مظہر کریم دریابادی۔
یہ سب لوگ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے
جرم میں گرفتار کیے گئے تھے۔ یہ حضرت اپنی وطنی آزادی حاصل کرنے
کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ یہی ان کا جرم تھا۔ دوسرا جرم
ان کا یہ تھا کہ انہوں نے انگریزی سرکار کی غلامی کرنے سے انکار کر دیا
تھا۔ ان سب پر بغاوت کا مقدمہ چلا تھا اور سب کو حبس دوام
کی سزائیں دی گئی تھیں۔
ان کو خوش نصیب ہی کہا جائے گا جو انڈمان کی جیل سے
سزا کاٹ کر اپنے گھر واپس آئے تھے۔ جبکہ کئی اصحاب نے تو
انڈمان کی جیل میں ہی دم توڑ دیا تھا۔ انڈمان جیل جسے اس
زمین پر دوزخ کہا جاتا تھا۔ اس سے زندہ گھر واپس آجانا
خوش نصیبوں کا ہی کام تھا۔
یہ سبھی صاحبان کافی تعلیم یافتہ اور ماہرین دینیات
تھے۔ لیکن اپنے ملک کی آزادی کے لئے انہوں نے دنیاوی
عیش و آرام کو ترک کر دیا تھا۔
اللہ انہیں اس نفس کی قربانی پر ان کی روح کو
سکون عطا کرے۔

شہید مرد مجاہد علی احمد صدیقی

قارئین کو یہ بتایا جاچکا ہے کہ ۱۹۱۳ء کے آغاز میں امریکہ کے سان فرانسسکو شہر میں غدر پارٹی کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ یہ غدر پارٹی تمام ہندوستان میں ۲۱ فروری ۱۹۱۵ء کو غدر کرادینا چاہتی تھی۔ مگر بھانڈا پھوٹ جانے کی وجہ سے سرکار ہوشیار ہوگئی تھی، اور غدر کی سازش ناکامیاب ہوگئی تھی۔ مگر ہندوستان کے بیرون ممالک میں جہاں ہندوستانی پلٹنیں تھیں۔ انہوں نے ۲۱ فروری کو ہی سرکشی شروع کردی تھی۔ حکومت نے انہیں گرفتار کیا اور انہیں بہت سخت سزائیں دی گئیں

جناب علی احمد صدیقی بھی انہیں باغیوں میں سے ایک تھے۔ یہ فیض آباد (یوپی) کے رہنے والے تھے، اور ملایا میں مقیم تھے۔ ان کے ساتھ سید مجتبیٰ حسین جونپور والے، اور کچھ دیگر ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ بغاوت کی پاداش میں گرفتار کیا گیا تھا۔

ایسے اور بھی کتنے ہندو، مسلمان سپاہی سرکشی کے جرم میں گرفتار کیے گئے تھے۔ جنہیں لمبی سزائیں دی گئی تھیں۔

وطن پرست علی احمد صدیقی فیض آبادی کو انگریزوں نے بغاوت کے جرم میں ۱۹۱۷ء کو پھانسی پر چڑھادیا تھا۔

مرد مجاہد سید شیر علی خاں اور سید گلزار علیخاں

یہ دونوں مرد مجاہد امروہہ مرادآباد ضلع اترپردیش کے رہنے والے تھے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان دونوں مجاہدوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ انگریزوں نے ہماری پہلی جنگ آزادی کو غدر کا نام دیا ہے ان کے لئے وہ غدر تھا لیکن ہمارے لئے وہ پہلی جنگ آزادی تھی۔ یوں

تو اس جنگ کو ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء سے شروع ہونی لیکن میرٹھ چھاؤنی میں ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو ہی شروع کر دی گئی تھی۔ پھر جیسے جیسے اس جنگ کی خبر پھیلتی گئی۔ لڑائی بھی پھیلتی گئی۔ مراد آباد (اتر پردیش) میں بھی اس جنگ کا آغاز ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو کر دیا گیا۔ باغیوں نے مراد آباد جیل کا دروازہ توڑ ڈالا اور تمام قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ گویا کانپور غدر ہونے سے پہلے ہی مراد آباد میں غدر ہو گیا تھا۔ جہاں مسلم آبادی زیادہ ہے۔ جناب گلزار علی خاں جو مراد آباد میں مختیاری کا پیشہ کرتے تھے انہوں نے اسے خیرباد کہہ کر بغاوت کے لئے کمربستہ ہو گئے سب سے پہلے انہوں نے جیل سے جو قیدی رہا ہوئے اور دیگر باغیوں کو لیکر امروہہ کے لئے نکل پڑے۔ امروہہ قصبہ میں انہیں بغاوت کے لئے زمین ہموار ملی۔ اس میں انقلاب کے بیج بونے تھے۔

مجاہد گلزار علی خاں نے اسی رات شیخ رمضان علی خاں کے مکان پر پنچایت کی، اور ۲۰ مئی کو علی الصبح مجاہد گلزار علی خاں کی نمائندگی میں امروہہ کے تھانہ پر حملہ کر دیا گیا۔ اس حملے میں قصبے کے کئی ہزار لوگ شریک ہوئے تھے۔ باغیوں نے تھانے داروں، اور سپاہیوں کو قتل کر کے تھانے کو جلا دیا۔ اس کے بعد باغیوں نے تحصیل کا رخ کر کے وہاں کا خزانہ لوٹ لیا۔ پھر تحصیل کے دفتر کو بھی آگ لگا دی۔ باغیوں نے پورے قصبے پر اپنا قبضہ کر لیا۔ مجاہد گلزار علی خاں نے اب اپنے گورنر ہونے کا اعلان کر دیا۔ حکام نے صورتحال پر قابو پانے کی ہر چند کوشش کی مگر ناکامیاب رہے لیکن جب جنرل ولسن اپنی فوج لے کر امروہہ پہنچا تو سید گلزار علی خاں وہاں سے فرار ہو گئے۔ ولسن نے گلزار علی کے گھر کو تباہ کر دیا ۲۶ مئی کو ولسن مراد آباد واپس چلا گیا۔ ولسن کے چلے جانے کے بعد باغیوں نے پھر بغاوت کی آگ بھڑکا دی، اور امروہہ سے انگریزوں کی حکومت ہی چند ماہ کے لئے ختم کر دی۔

امروہہ قصبے میں بغاوت کا جھنڈا سید شیر علی خاں نے ہی اُٹھایا تھا۔ یہی وہاں کے لیڈر تھے۔ سرکار کو سب سے زیادہ ان پر ہی غصہ تھا۔ انگریزوں کی توپوں کے سامنے بھلا ان کی کیا بساط تھی۔ صرف لاٹھیوں اور تلواروں سے لڑائی نہیں ہو سکتی تھی۔
انگریزوں نے جلد ہی پھر قبضہ کر لیا، اور انگریزوں نے نواب رامپور کی مدد سے بہت جلد صورت حال پر قابو پا لیا۔ اس وقت بہت سے نواب اور راجے انگریزوں کی ہی مدد کر رہے تھے۔
۱۸۵۸ء کے شروع میں بہت سے باغیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر مقدمے چلائے گئے۔ سید شیر علی خاں کو حبسِ دوام کی سزا سنائی گئی، اور انہیں انڈمان بھیجا گیا اور ان کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی۔ سید گلزار علی خاں پھر ایکبار فرار ہو گئے۔ اور پھر کبھی وہ انگریزوں کے ہاتھ نہیں لگے۔ اگر ہاتھ آجاتے، تو انہیں پھانسی ملنا یقینی تھا۔
سیّد شیر علی اور سیّد گلزار علی کی ہمت کی داد دینا چاہیے۔

جنگ آزادی کے شہید اسرائیل اللہ رکھا مالیگانوی

جوشیلے اور وطن پرست شہید اسرائیل اللہ رکھا ۱۸۹۲ء میں مالیگاؤں ضلع ناسک (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم مالیگاؤں میں ہی ہوئی تھی۔
ان کا خاندان غریب تھا۔ اس لئے انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل نہ ہو سکی۔ مالیگاؤں کے ہی ایک کارخانہ میں وہ نوکر ہو گئے۔ حب الوطنی کا جذبہ ان میں قدرتی تھا۔ ۱۹۲۱ء کے خلافت اور کانگریس کی مشترکہ تحریک نے ان کے جوش میں اُبال لا دیا اور انہیں بھی کچھ کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔ لہٰذا وہ بھی سر پر کفن باندھ کر تحریک میں شامل ہو گئے۔ چونکہ وہ ایک جوشیلے نوجوان تھے اس لئے مہاتما گاندھی کے

نان وائیلنس (اہنسا) کے اصولوں پر وہ عمل پیرا نہ رہ سکے۔
جناب اللہ رکھا کی تقریر بڑی جوشیلی اور اشتعال انگیز ہوتی تھی، اور وہ خلافت کے لیڈروں میں سے تھے۔ اس لئے پولس کی نظروں پر بھی پہلے ہی سے چڑھے ہوئے تھے۔ انہوں نے انہوں نے اپنے ساتھیوں کو لے کر شراب اور بدیسی کپڑے کی دکانوں پر پکیٹنگ کی۔ بدیسی کپڑوں کی ہولی بھی جلائی جاتی تھی پولس بھی اپنی زیادتیوں اور ظلم سے باز نہیں آتی تھی۔ ایک دن یہ جھگڑا بہت بڑھ گیا۔ پولس نے لاٹھی اور گولی چلائی تو پبلک نے اس کا جواب اینٹ اور پتھر سے دیا۔ پولس کی لاٹھی اور گولی سے بہت سے لوگ زخمی ہوئے، اور شہید تک ہو گئے۔ اس کی فکر پولس کیوں کرتی۔ ؟ مگر جب ایک پولس کا سب انسپکٹر جو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تو واویلا مچ گیا۔ بہت سے لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ خلافت تحریک کے سرگردہ کارکن جناب اسرائیل اللہ رکھا کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر ایک پولس کے آفیسر کے قتل کا الزام لگایا گیا۔ حالانکہ پولس کو ان کے خلاف کوئی چشم دید شہادت نہیں ملی تھی۔ لیکن پولس کے لئے اتنی شہادت ہی کیا کم تھی کہ انہوں نے بھی اس دن پولس کے ساتھ تصادم میں حصّہ لیا تھا۔ تب تو تمام تماشائی نہیں رہے ہوں گے۔ ضرور خشت بازی کی ہوگی۔ پولس نے کسی سے کہلوا بھی دیا ہوگا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے اسرائیل اللہ رکھا، کو پولس کو اینٹ پتھروں سے مارتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان پر مقدمہ چلا اور عدالت نے انسپکٹر کے قتل کے جرم میں انہیں پھانسی کی سزا سنادی۔ آپ نے اپنی سزا کے خلاف اپیل کی مگر وہ خارج کر دی گئی۔ ان کی پھانسی کی سزا بحال رہی۔ ۱۷ر جولائی ۱۹۲۲ء کو پونہ کی یروڈا جیل میں اسرائیل اللہ رکھا کو صبح ۶ بجے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

شہید محمد عبدالغفور خاں

امر شہید عبدالغفور خاں ایک زندہ دل انسان تھے ؎

زندگی زندہ دِل کا نام ہے
مُردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

وہ زندہ دل انسان تھے۔ خدا کے فضل سے زندہ دل پہلوان بھی تھے، اور پہلوان صرف اکھاڑے کے ہی نہیں بلکہ سیاست کے بھی پہلوان تھے ۔ لہٰذا وہ اپنی پہلوانی کو پھانسی کے تختے پر بھی آزمانا چاہتے تھے ۔ اپنے اِس میدان میں وہ کامیاب رہے ۔ مالیگاؤں کا یہ پہلوان پھر ہندوستان کا پہلوان بن گیا۔

جناب محمد عبدالغفور خان ۱۸۹۶ء میں مالیگاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام محمد شکور مومن تھا۔ وہ اپنے گاؤں میں ہی کرگھے پر کپڑا بنا کرتے تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ جس کپڑے کو وہ بُن رہے ہیں وہ ایک دن ان کا کفن بنے گا۔

یہ زمانہ تھا خلافت اور کانگریس کے آندولن کا۔ دونوں تحریکیں اس وقت مل جل کر چل رہی تھیں ۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور مہاتما گاندھی میں ان دنوں گاڑھی چھن رہی تھی، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں ان کی اس اہنسا کو دل سے ماننے والا ان کے سوا کوئی نہ تھا کہ انگریز دل کی مار تم کھاتے رہو لیکن تم ان پر ہاتھ مت اُٹھانا، پٹ جانا ثواب ہے اور پیٹنا عذاب ہے ۔

دشمن سے یہ لڑائی نہیں بلکہ لڑائی کا ایک مذاق تھا ۔ علی برادران اور ان کے کارکنان اس بات کے لئے تیار نہیں تھے جو کچھ کرو وہ سرکار سے پوچھ کر کرو، سرکار کو اطلاع دے کر کرو۔ ۱۹۲۲ء کے اواخر میں گورکھپور کے ایک تھانہ چورا چوری کو پبلک نے جب

اُسے جلا دیا اور تھانہ کے اندر بند چند سپاہی بھی جلا دیے گئے تو گاندھی جی نے کہا یہ تو غضب ہو گیا۔ ستیہ گرہ کی لڑائی بند کر دو ہمیں ہنسا یعنی "تشدد" سے آزادی نہیں چاہیے۔ اس طرح علی برادران "ستیہ گرہ" اور اہنسا کے پجاری مہاتما گاندھی سے الگ ہو گئے اور اپنا خلافت کا آندولن وہ اس کے بعد بھی چلاتے رہے تھے۔

ایک دن غفور پہلوان مالیگاؤں کی شراب کی دکان پر اپنے ساتھیوں کو لے کر پکیٹنگ کر رہے تھے۔ دکان کے مالک نے جھگڑا کر کے اپنی دکان بند کر دینے سے صاف انکار کر دیا۔ جب جھگڑا بہت زیادہ بڑھ گیا تو ہجوم بڑھ گیا۔ پولیس نے لاٹھی گولی کا۔ تو پبلک نے اینٹ پتھر کا سہارا لیا۔ یہاں بھی ایک سپاہی ہلاک ہو گیا۔ غفور پہلوان کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر قتل کا مقدمہ چلا اور پھر انہیں بھی پونہ کی منحوس جیل یروڈا میں ۱۸ر جنوری ۱۹۲۳ء کو صبح ۶ بجے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

مجاہد جنگِ آزادی ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی پیدائش ۸ر فروری ۱۸۹۷ء میں حیدرآباد میں ہوئی وہاں سے آبائی وطن فرخ آباد لوٹ آئے۔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے علیگڈھ چلے گئے۔ ۱۹۲۵ء میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی سرپرستی میں مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابو الکلام آزاد جیسے لوگوں کے ساتھ کانگریس کی تحریک میں شامل ہو گئے اور وطن کی آزادی کے لئے کام کیا۔

ذاکر صاحب نے جرمن کی برلن یونیورسٹی سے معاشیات کا تحقیقی مطالعہ کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ جامعہ ملیہ کا ادارہ جو

علیگڈھ سے دلی منتقل کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو اس کا وائس چانسلر بنایا گیا۔ وہ اس عہدے پر بائیس سال تک فائز رہے۔ اور کافی ترقی کے مواقع پیدا کیے۔ گاندھی جی کو معلوم تھا کہ ڈاکٹر حسین ایک نئے طریقۂ تعلیم کا تجربہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس طریقۂ تعلیم کا نام "بنیادی تعلیم" رکھا اور بنیادی تعلیمی کمیٹی کا صدر ڈاکٹر صاحب کو ہی بنایا گیا۔ ذاکر صاحب ایک عمدہ معلم تھے وہ معلمی کے پیشہ کو بہت عزت کا پیشہ خیال کرتے تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے تعلیم پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اور "ابو خاں کی بکری" جیسی نصیحت آمیز کہانیاں بھی لکھی ہیں وہ حقیقت میں علم دوست تھے ؎

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبرؔ، پھول پتوں میں نہاں ہو کر

کانگریس نے ذاکر صاحب کی قابلیت، علم دوستی اور حب الوطنی کا خوب فائدہ اُٹھایا۔ ۱۹۵۲ء میں انہیں بہار کا گورنر بنا دیا گیا۔ بہار کی ترقی میں انہوں نے چار چاند لگا دیئے۔ انہوں نے جس بڑے سے بڑے عہدہ پر کام کیا اس کو ہی رونق بخش دی۔ وہ پہلے پانچ سال تک جمہوریہ ہند کے نائب صدر رہے اور اس کے بعد ۱۹۶۷ء میں وہ ہندوستان کے صدر چنے گئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو ملک کے سب سے بڑے خطاب "بھارت رتن" کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ اس موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

"سارا ہندوستان میرا گھر ہے اور اس میں رہنے والے تمام لوگ میرا کنبہ ہے۔ میں اس ملک کو خوبصورت، مضبوط اور خوشحال بنانے کی کوشش کروں گا۔"

وہ سادگی، صاف گوئی، نیک کرداری اور خلوص کا پیکر تھے۔ ۳ مئی ۱۹۶۹ء کو اچانک وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شہیدِ وطن

اشفاق اللہ خاں

حسرت وارثی

امر شہید، اشفاق اللہ خاں حسرت وارثی، مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو شاہ جہاں پور کے محلہ امن زئی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد شفیق الرحمٰن محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے۔ ان کی والدہ محترمہ کا نام مظہر النساء تھا۔ جو کافی تعلیم یافتہ اور دور اندیش پٹھان خاتون تھیں۔ اشفاق کے علاوہ پانچ بھائی بہن تھے اور اشفاق سب سے چھوٹے ہونے کے باعث وہ سب سے زیادہ پیارے تھے۔

اشفاق جب شاہ جہاں پور کے مشن ہائی اسکول میں پڑھتے تھے تبھی ان کی ملاقات پنڈت رام پرشاد بسمل سے ہو گئی تھی۔ پنڈت رام پرشاد، حالانکہ اشفاق سے دو درجہ آگے تھے۔ اشفاق کو تو تلاش کسی جوشیلے محبِ وطن کی تھی۔ جس کی زندگی کا نصب العین غلام دیش کو آزاد کرانا ہو اور جینا و مرنا صرف اپنے وطن کے لئے ہو۔ اشفاق اپنی تلاش میں کامیاب ہوئے۔ انھیں پنڈت رام پرشاد میں وہ سب باتیں ملیں جو وہ چاہتے تھے۔ لہٰذا دونوں کی دوستی ہو گئی، اور یہ دوستی اس قدر پروان چڑھی کہ کچھ ہی دنوں میں دونوں ہم پیالہ اور ہم نوالہ ہو گئے۔ جبکہ رام پرشاد آریہ سماجی برہمن تھے اور اشفاق پٹھان مسلمان تھے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں انگریزوں ہی کی وجہ سے شاہجہانپور میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ جس وقت مسلمان آریہ سماج میں آگ لگانے جا رہے تھے، تو اشفاق نے اپنی پستول لے کر، بھیڑ کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور کہا۔

"آپ لوگ اشفاق کی لاش پر سے گزر کر ہی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ آپ لوگ جانتے نہیں۔ جس آریہ سماج مندر میں تم لوگ آگ لگانے جا رہے ہو اس میں تو اشفاق کا رام رہتا ہے۔"

اور اسی طرح رام پرساد نے بھی ہندوؤں کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ ان دونوں سچے دوستوں اور وطن کے شیدائیوں نے فسادیوں کو لوٹ مار، خون خرابہ کرنے سے روک دیا تھا۔

اشفاق اور پنڈت رام پرشاد کی مثالی دوستی تھی۔ مسلمانوں کو اعتراض تھا کہ اشفاق ہندو ہو گیا ہے۔ جبکہ ہندوؤں کا کہنا تھا کہ رام پرشاد مسلمان ہو گیا ہے۔ کیونکہ دونوں ایک ساتھ ایک ہی تھالی میں کھانا کھاتے ہیں۔ ان گمراہوں کو کیا پتہ تھا کہ دونوں سچے انسان بن گئے ہیں۔ ؎ بقول اقبال

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

۸۔ اگست ۱۹۲۵ء کو رام پرشاد نے دس نوجوان انقلابیوں کی ایک میٹنگ بلائی اور تجویز رکھی کہ انقلابی پارٹی کے لئے اسلحہ خریدنا ضروری ہے۔ اس لئے ہمیں سرکاری خزانہ لوٹنا چاہیئے۔ اشفاق نے اتفاق رائے نہ کرتے ہوئے یہ نیک مشورہ دیا کہ پارٹی ابھی کمزور ہے۔ ہمیں ایسا خطرناک کام نہ کرنا چاہیئے اگر ہم لوگ پکڑ لئے گئے تو ہماری پارٹی تباہ ہو جائے گی۔"

اشفاق کی صلاح کو اشفاق کی کمزوری سمجھا گیا، اور ساتھیوں نے انھیں بزدل اور ڈرپوک تک کہہ ڈالا۔ تب اشفاق کو بھلا یہ بات کیسے برداشت ہوتی۔

۹۔ اگست ۱۹۲۵ء کو جب دس انقلابیوں نے سرکاری خزانہ لے جانے والی سہارنپور پسنجر گاڑی کو لکھنؤ سے کچھ فاصلے پر کاکوری اسٹیشن کے قریب اس ٹرین کی زنجیر کھینچ کر درمیان میں رکوایا تھا۔ وہ اشفاق ہی تھے انھوں نے خزانے کے آہنی صندوق کو نہ توڑ ڈالا ہوتا، تو خزانہ لوٹنے کی اسکیم ہی فیل ہو جاتی۔

آخرکار اس کا وہی نتیجہ نکلا جس کا اشفاق نے پہلے سے ہی اشارہ

کر دیا تھا۔ صرف چندر شیکھر آزاد کے دیر سویر سبھی لوگ گرفتار کرلئے گئے تھے۔ اشفاق اور سچندر ناتھ بخشی فرار تھے اور پولس انھیں قریب ایک سال کے بعد ہی گرفتار کر سکی تھی اور ان دونوں پر الگ سے لکھنؤ میں مقدمہ چلایا گیا۔ کل ۴۴ نوجوان گرفتار کئے گئے تھے۔ ان میں سے ۴ کو پھانسی، اور ۱۸ کو لمبی سزا دی گئی تھی۔

پھانسی کی سزا پانے والوں میں رام پرشاد، روشن سنگھ، راجیندر ناتھ لاہڑی اور اشفاق اللہ خان تھے۔

جب اشفاق کو ۱۳ جولائی ۱۹۲۷ء کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تو انھوں نے جج کا شکریہ ادا کیا اور پراسی کیوٹنگ انسپکٹر سے مصافحہ کیا اور کہا کہ دوران مقدمہ اگر مجھ سے آپ کی شان میں کچھ نامناسب بات زبان سے نکل گئی ہو تو مجھے معاف کرنا۔ آپ سرکار کے نوکر ہیں۔ آپ نے اپنا فرض ایمان داری سے ادا کیا ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

اشفاق کی حب الوطنی۔ سچی دوستی۔ اور وفاداری کے بارے میں جتنا لکھا جائے اتنا کم ہے۔ لوگ سرکار سے اپیلیں کرتے ہیں تاکہ ان کی سزا کم ہو جائے مگر اشفاق نے نجی طور پر سرکار سے یہ اپیل کی کہ پنڈت رام پرشاد بسملؔ قطعی قصوروار نہیں ہیں۔ سب قصور ان کا ہے۔ لہٰذا رام پرشاد کو پھانسی نہ دی جائے۔ پھانسی صرف ان کو ہی ہونی چاہیے کیونکہ ٹرین کا خزانہ لوٹنے کا کام فقط ان کے ہی ایماء پر کیا گیا تھا۔

فیض آباد جیل کے حکام جب ۱۹، دسمبر ۱۹۲۷ء کو، اشفاق کو پھانسی گھر چلنے کے لئے لینے آئے تو انھوں نے دیکھا کہ اشفاق تو قرآن شریف کا بستہ اپنے کندھے سے لٹکائے پہلے سے ہی تیار بیٹھے ہیں۔ وہ ایک حاجی کی طرح ان کے ساتھ ہولئے۔

تختہ دار پر چڑھنے سے قبل جب اُن سے اُن کی آخری خواہش اور آرزو معلوم کی گئی تب انہوں نے کہا تھا ؎

"کچھ آرزو نہیں ہے، ہے آرزو تو یہ ہے
رکھ دے کوئی ذرا سی خاکِ وطن کفن میں"

جیل کے حکام دنگ تھے اور انگشت بدنداں تھے کہ یہ کیسا حیرت انگیز انسان ہے جو پھانسی کے وقت بھی خوش ہے اور اپنے کفن کے لئے تھوڑی سی خاکِ وطن چاہتا ہے، کیونکہ اس کے قبل ایسے بہادر اور فرشتہ سیرت انسان کے انھیں کبھی درشن نصیب نہیں ہوتے تھے۔

جیلر نے کہا: "انشاء اللہ آپ کی یہ خواہش ضرور پوری کی جائے گی۔"

دوسری ایک خواہش اشفاق کی یہ بھی تھی کہ جلاد منے خاں غسل کرکے ہی ان کے پاک جسم کو ہاتھ لگائے، اور پھانسی کی رسیوں کو چوم لینے کے بعد ہی وہ ان کے گلے میں رسیوں کو پہنائے۔ ان کی یہ خواہش فوراً پوری کی گئی۔ جلاد منے خاں نے غسل کرنے کے بعد ہی اشفاق کے جسم کو چھوا جس کے کاندھے سے مقدس قرآن شریف کا بستہ لٹک رہا تھا

تختہ دار پر کھڑے ہو کر اشفاق نے کہا:

"میں نے اپنے ہاتھ انسانی خون سے کبھی نہیں رنگے ہیں۔
اب میرا انصاف خدا کے یہاں ہوگا۔"

جلاد منے خاں نے پوچھا: "خاں صاحب! آپ تیار ہیں"؟

اشفاق نے کہا:

"ہاں! بھارت ماتا کی جے۔ وندے ماترم۔"

اتنا کہتے ہی جلاد نے اشفاق کو اس پھانسی پر چڑھا دیا جسے وہ معراجِ عاشقاں کہا کرتے تھے۔

پھول برساتی ہے دنیا آج تربت پر تیری
زندگی بھی رشک کرتی ہے شہادت پر تیری

مشہور مجاہد جنگِ آزادی مولانا حسرت موہانی

مولانا حسرت موہانی قصبہ موہان ضلع اناؤ (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔ موہان میں پیدا ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ لفظ موہانی جڑ گیا۔ ان کا تخلص حسرت تھا۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر تھے اور ان کے نام پر ان کا ایک دیوان بھی شائع ہوا ہے، جو غزلیات پر مبنی ہے۔ وہ ایک ایسے وطن پرست انسان تھے۔ جو وطن کی آزادی کے لیے تمام عمر کوشش کرتے رہے۔ ان کی تقریر بڑی پُر جوش اور ولولہ انگیز ہوتی تھی۔ وہ کانگریس کے لیڈر بھی رہے ہیں۔ مہاتما گاندھی کے ساتھ ان کی کبھی نہ بنی، کیونکہ مہاتما گاندھی جتنے نرم تھے، مولانا حسرت موہانی اتنے ہی زیادہ گرم تھے۔ سب سے پہلے مکمل آزادی کی تجویز مولانا حسرت موہانی نے ہی کانگریس ۱۹۲۱ء کے احمد آباد اجلاس میں رکھی تھی جو گاندھی جی کی وجہ سے پاس نہ ہو سکی۔ بال گنگا دھر تلک کو مولانا حسرت موہانی زیادہ پسند کرتے تھے۔ جن کا نعرہ تھا.....

"آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے"

تلک کی آزادی کا مطلب ہوم رول تھا۔ حکومت یعنی بادشاہ انگلشیہ کا سایہ ہمارے اوپر برابر بنا رہے۔ اس خیال کو برج نرائن چکبست نے ایک شعر میں یوں واضح کیا ہے ؎

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم "ہوم رول" کے بدلے

حسرت موہانی نے ہی سب سے پہلے علیگڑھ میں سودیشی اسٹور قائم کیا تھا۔ وہ بدیشی چیزوں کا استعمال بالکل نہیں کرتے تھے۔ کانگریس کے دیگر لیڈر مکمل آزادی نہیں چاہتے تھے، مگر حسرت موہانی کا نظریہ ہمیشہ مکمل آزادی کا رہا ہے۔ جبکہ آزادی اور آزادانہ خیالات کی وجہ سے

انہوں نے بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھائی ہیں ۔غربت نے کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا ۔ مفلسی میں بھی وہ آزاد تھے اور جیل میں بھی شاد تھے ۔ انہوں نے ایک شعر میں کہا ہے ؎

طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
ہے مشق سخن جاری اور چکی کی مشقت بھی

حسرت صاحب منکسر المزاج ، بڑے شریف انسان تھے ۔ کانپور کا تو بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا ۔ ان کی علمیت ، شاعری اور سیاسی زندگی نے ان کو بہت مشہور کر دیا تھا ۔ حسرت موہانی جیسا قابل اور وطن پرست شخص مسلمانوں میں اور کوئی نہ ہوا کانپور کو ان کی ہستی پر فخر تھا ؎

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

مولانا حسرت موہانی تو خود بہ شکل انقلاب تھے ۔ ان کے بارے میں جتنا بھی لکھا جائے وہ کم ہے ۔ مولانا کانپور کی نئی سڑک کے کمال خاں احاطہ کے مکان نمبر ۴۴/ ۲۷ امین رہتے تھے مگر ان کی وفات ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ میں ہوئی تھی ۔ لکھنؤ میں وہ اپنے ایک دوست کے یہاں تھے ۔ لکھنؤ میں مولانا حسرت موہانی کا مزار مولوی انوار صاحب کے باغ میں ہے ۔ راقم مولانا سے واقف تھا ، اور اس نے اپنے ایک ساتھی رمیش گپت کے ساتھ کمال خاں کے احاطہ میں جا کر ان کے گھر کی زیارت (۱۹۸۷) میں کی ۔ لکڑی کے اس ٹوٹے تختے کو بھی پُرنم آنکھوں سے چھو کر دیکھا جس پر وہ آرام فرمایا کرتے تھے ۔ (واہ ! حسرت !)

مشہور مجاہد میاں حمید خاں

ـــــــــ وَلد حمید اخاں

میاں حمید خاں کا نام کان پور کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے میاں حمید خاں نے تلک ہال کان پور کو اپنا گھر بنا رکھا تھا۔ وہ دن اور رات اسی میں رہا کرتے تھے۔ تلک ہال کے ایک گوشے میں، ایک تخت پر ان کا بستر پڑا رہتا تھا۔ اگر کبھی تلک ہال میں میٹنگ ہوتی تو اس کا انتظام وہی کرتے تھے۔ وہ کرسیاں رکھتے اور دریاں بچھاتے تھے۔ جب کبھی تلک ہال سے کوئی سیاسی جلوس اٹھتا تو اس کا انتظام میاں حمید خاں ہی کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ میاں حمید خاں تلک ہال کی روح تھے۔ میاں حمید خاں جیسا سچا اور وفادار کارکن مسلمانوں میں کیا ہندوؤں تک میں نہیں ہوا ہے۔ ہر ہندو کا گھر میاں حمید کا تھا۔ سینکڑوں ان کی مائیں بہنیں بھابیاں اور بیٹیاں تھیں۔ پڑھے لکھے وہ برائے نام تھے۔ مگر سمجھ دار کافی تھے۔ کانگریس ان کی جان تھی اور سیاست ان کا ایمان تھا۔ پھر بھی وہ پکے اور سچے مسلمان تھے۔ نہایت حلیم اور نہایت خاکسار اور ہر دلعزیز۔

کانگریس کمیٹی نے حمید خاں کی بے لوث خدمات کا صلہ دینے کے لئے انہیں ۱۹۵۲ء میں ایم۔ ایل۔ اے کے چناؤ میں ہندو وارڈ سے کھڑا کیا۔ ہندو امیدوار اُن کے مقابلے میں ہار گیا۔ اگر انہیں کہیں مسلم وارڈ سے کھڑا کیا جاتا تو یہ یقینی امر تھا کہ انہیں اتنے زیادہ ووٹوں سے کامیابی نہ ملتی اور ان کا ہار جانا بھی ممکن تھا۔

کان پور کے بے تاج بادشاہ جناب گنیش شنکر ودیارتھی تھے۔ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ گنیش شنکر ودیارتھی خود کانگریس تھے۔

ان کے حکم کے بغیر کانگریس میں پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا، اور ہتوں کو ہلانے والے میاں حمید ہی تھے۔ وہ حکم دیتے اور حمید خاں اس پر عمل کرتے تھے۔ حمید خاں گنیش شنکر ودیارتھی کے وفادار پیرکار تھے۔ موت نے ان دونوں ہستیوں کو ہم سے چھین لیا ہے۔ ۱۹۳۱ء کے فساد میں ودیارتھی قتل کر دیئے گئے۔

۱۹۷۳ء میں میاں حمید خاں سخت بیمار پڑے اور مہینوں وہ ارسلا ہارسمین اسپتال میں پڑے رہے لیکن ڈاکٹر انہیں اچھا نہ کر سکے۔ آخر کار ۱۱ دسمبر ۱۹۷۳ء کو انہوں نے لبیک کہا۔ وہ ۲۵ راکتوبر ۱۹۰۵ء کی پیدا ہوئے تھے۔

جس تلک ہال میں ان کا بود و باش تھا ان کا جنازہ اب وہیں سے اٹھ رہا تھا۔ تلک ہال سے اب ان کا بستر ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا ہے مگر ان کی جگہ پر ان کی تصویر رکھ دی گئی ہے۔ جسے لوگ اپنی خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

خراج عقیدت حمید خاں کی حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے لئے پیش کرتے ہیں۔ لیکن حمید خاں کے اٹھ جانے سے تلک ہال کی رونق ہی اٹھ گئی ہے۔ میں نے تو انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ کانگریس کمیٹی کے جنرل سیکرٹری اور پھر اس کے صدر بھی رہے ہیں۔ ایسی پیاری ہستی اب کہاں......؟

ان کے جیسا سچا، ایماندار اور جفاکش مسلمان اب کانپور میں کہاں رہے۔ وطنی دیوانہ حمید خاں زندہ باد ••

چھپے چھپے رہیں یہاں جو ہر یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

جنگ آزادی کے مشہور مجاہد رفیع احمد قدوائی

جناب رفیع احمد قدوائی مجاہد جنگ آزادی اتر پردیش کے ایک ایسے لیڈر تھے جن کے پیروکاروں میں ہندوؤں کی ہی اکثریت تھی۔ تعصب سے ان کی ذات مبرا تھی۔ وہ بڑے خوش دل اور ہنس مکھ انسان تھے۔ امیر غریب سب ان کے دوست تھے۔ یوپی کے ہوم منسٹر تھے مگر ان کے بنگلے کا پھاٹک ہر کسی کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ ان کا ملاقاتی بغیر کسی اطلاع کے ان کے کمرے میں گھس کر ان سے باتیں کر سکتا تھا۔ جبکہ دوسرے منسٹروں سے ملنے کے لئے بڑی دشواری ہوتی تھی۔ وہ ہر شخص سے خلوص کیساتھ ملتے تھے۔ پریشان حال لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنا ان کا شیوہ تھا۔ کچھ اسی قسم کی خوبیوں کی بناء پر قدوائی صاحب کے بہی خواہوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ وہ خود ہی اپنی مثال آپ تھے اور دوسروں کے لئے ان کی زندگی مشعل راہ تھی۔ ان کا مزار قصبہ مسولی ضلع بارہ بنکی میں ایک یادگار ہے۔ اسی قصبے میں وہ سنہ ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔

قدوائی صاحب کی شہرت سن کر ہی پنڈت جواہر لال نہرو نے جو کہ وزیر اعلیٰ تھے۔ انہیں دہلی بلا لیا تھا اور انہیں اپنی کابینہ میں شامل کر کے رسل و رسائل اور غذا جیسے اہم شعبے ان کے سپرد کر دیئے تھے۔ اتنے بڑے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود قطاروں میں کھڑے ہو کر انہوں نے معلوم کیا تھا کہ پبلک کو تار بھیجنے رجسٹری کرانے اور راشن وغیرہ لینے میں کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ انہوں نے ان محکموں میں سدھار کر کے لوگوں کی تکلیفوں کو کسی حد تک کم کر دیا۔ یہ ان کی ہمت تھی کہ انہوں نے راشننگ ہی ختم کر دی تھی۔

رفیع احمد قدوائی صاحب خود ایک بڑے زمین دار تھے مگر یوپی میں زمین داری ختم کرا دینے کا قانون انہوں نے ہی پاس کروایا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ عوام کے فائدے کو ہی مدنظر رکھا حالانکہ اس بات کو لے کر ان کے خاندان کے لوگ ان سے ناراض ہو گئے تھے۔

ایک دفعہ قدوائی صاحب اچانک دوپہر کے وقت تلک ہال کانپور میں آ گئے اور ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ تلک ہال میں اس وقت میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ سب کھانا کھانے کے لئے چلے گئے تھے۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا، میرے سامنے کی بنچ پر قدوائی صاحب بیٹھے ہیں۔ میں نے انہیں سلام کیا اور ان سے کہا: "سب لوگ اس وقت کھانا کھانے کے لئے چلے گئے ہیں۔"

انہوں نے فرمایا: "اپنے صدر صاحب شیو نرائن ٹنڈن سے کہو کہ قدوائی صاحب تلک ہال میں بھوکے بیٹھے ہیں اور آپ کھانا کھا رہے ہیں۔"

میں نے فوراً صدر صاحب کو ٹیلی فون کیا تو وہ بھاگتے ہوئے تلک ہال میں آ گئے۔ اس درمیان اور حضرات بھی تشریف لے آئے۔ قدوائی صاحب دہلی سے آئے تھے اور لکھنؤ تشریف لے جا رہے تھے۔ ٹرین چھوٹنے میں دو گھنٹے کی دیر تھی۔ صدر صاحب نے ان کے لئے کھانا منگانے کا حکم دیا تو انہوں نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ "کھانا کھانے کے لئے ان کے پاس وقت نہیں ہے۔ ٹرین میرا انتظار کئے بغیر چل دے گی۔" صدر صاحب نے اصرار کیا: "اگر کھانا کھانے کا وقت نہیں ہے تو چائے تو پی ہی سکتے ہیں۔ بغیر چائے پلائے ہم لوگ آپ کو جانے نہیں دیں گے۔" اس پر آپ نے فرمایا: "ٹھیک ہے چائے کے پیسے میرے حوالے کر دو۔ میں اسٹیشن پر جا کر چائے پی لوں گا۔" جب صدر صاحب نے چائے کے پیسے قدوائی صاحب

کی جیب میں ڈالے تو انہوں برجستہ کہا: "سلام - اب میں جاتا ہوں" تک ہال ہنسی میں ڈوب گیا - قدوائی صاحب کی سادگی اور زندہ دلی سے سب ہی متاثر تھے - ان کی شگفتہ طبیعت کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے......

ایک بار ان کے ایک چچازاد بھائی بیمار ہو کر ولنگڈن اسپتال میں داخل ہو گئے - قدوائی صاحب ان کی عیادت کے لیے گئے اور ان کے قریب شیشیوں کا ڈھیر دیکھ کر آپ نے ہنستے ہوئے فرمایا: "ارے بھائی - اس تام جھام کی کیا ضرورت ہے - مجھے جب مرنا ہوگا تو دیکھنا منٹوں میں مرجاؤں گا"

خدا کی مصلحت دیکھیے - انہیں جب موت آئی تو انہیں منٹوں میں اٹھالے گئی - انہوں نے پیار سے اپنی عادت کے مطابق ہنسی مذاق کی تھی، مگر حقیقت بن کر ان کے سامنے آگئی تھی -

رفیع احمد قدوائی صاحب کو ایک عرصہ سے ہائی بلڈ پریشر کی شکایت تھی اور ایک دو بار ہلکے دل کے دورے بھی پڑ چکے تھے مگر وہ سفر کے دوران دل کے دوروں کی بہت کم پرواہ کرتے تھے - انہوں نے آخر دم تک فلاحی کاموں میں حصّہ لیا -

۱۹۵۴ء کے اکتوبر میں دہلی میں میونسپل بورڈ کے چناؤ ہو رہے تھے - اس وقت جن سنگھیوں کا بہت زور تھا - ایک پبلک میٹنگ میں جناب قدوائی صاحب کو تقریر کرنی تھی - ان کی طبیعت اس وقت ناساز تھی مگر وہ ممبر پارلیمنٹ شریمتی سبھدرا کماری جوشی کے اصرار پر چلے گئے - اونچا اسٹیج بنایا گیا تھا - وہ بمشکل تمام اس پر چڑھ سکے تھے - دس بارہ منٹ تک بول سکے تھے کہ انہیں دل کا دورہ پڑ گیا تھا اور وہیں گر پڑے لوگوں نے انہیں جلدی سے ان کے بنگلے پر پہونچا دیا - اپنی شیروانی اتار کر ایک کھونٹی پر ٹانگ کر وہ پلنگ پر گر گئے - فوراً ڈاکٹر کو

بلایا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے قدوائی صاحب کو مردہ قرار دیا۔
کروڑوں کے پیارے سب کو روتا چھوڑ کر عالم بالا میں
پہنچ گئے۔ یہ تاریخ تھی ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء۔

مشہور مجاہد خان عبدالغفار خان

خان عبدالغفار خان کو "فرنٹیر گاندھی" اور "بادشاہ خاں" کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ آج خان صاحب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ انہیں گاندھی اس لئے کہا جاتا ہے کہ عدم تشدد کے قائل تھے۔ مہاتما گاندھی بھی ان ہی کے ہم قدم تھے۔ انہیں شہرت اس لئے بھی زیادہ ملی کہ وہ سرحدی پٹھان تھے۔ سرحدی صوبہ تقسیم کے بعد پاکستان میں شامل کیا گیا ہے۔ لیکن دلوں کی تقسیم نہ کبھی ہوئی ہے اور نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ سرحدی عبدالغفار خان کے لئے ہر ہندوستانی کے دل میں ایک گہری عقیدت اور بے پناہ محبت ہے۔ آزادی کے لئے جیل کی تکالیفیں برداشت کی ہیں۔ مشکلات کا سامنا کرنے کی خاطر اپنے عیش و آرام کو قربان کر دینا پڑا۔

خان صاحب اپنے قد و قامت کے لحاظ سے ہی بلند نہیں بلکہ وہ اپنے خیالات اور حب الوطنی کے جذبات سے بھی بلند ہیں۔ ہم انہیں افغانی، پختونی اور پاکستانی سے زیادہ ہندوستانی سمجھتے ہیں۔ ہم جب کبھی ماضی کی تاریخ دہرائیں گے بادشاہ خاں ہمارے دلوں پر حکومت کرتے محسوس ہوں گے۔

بادشاہ خاں، خدائی خدمتگار جماعت کے وہ سرکردہ لیڈر ہیں جنہوں نے اس جماعت کی بنیاد عوام کی خدمت کرنے کے لئے رکھی تھی۔

ہندوستان کی آزادی کے لئے بادشاہ خان ہندوستان

کی جیلوں میں قید رہے تھے۔ اس کے بعد پختونوں کی آزادی کے لئے وہ پاکستانی جیلوں میں قید کئے گئے۔ جیلوں کی جتنی صعوبتیں خان صاحب نے اٹھائی ہیں اور جتنی بار انہیں جیلوں میں قید کیا گیا ہے اتنی بار تو ہندوستان اور پاکستان کے کسی بھی لیڈر کو قید نہیں کیا گیا۔ پھر بھی انہوں نے آزادی کے خیال کو کبھی ترک نہیں کیا۔

چکبست کا یہ شعر بادشاہ خان عبدالغفار خان پر بالکل صادق آتا ہے ؎

وہ میری زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
میرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے!

بادشاہ خان ۱۸۹۰ء میں افغانستان کے اتمان زئی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام بہرام خان تھا۔ جو نہایت رحم دل اور پرخلوص انسان تھے۔ ان میں کسی قسم کا تکبر نہیں تھا۔ خان صاحب کی والدہ بھی بڑی نیک، رحم دل اور پاک دامن خاتون تھیں۔ بادشاہ خان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان بھی بڑے مشہور ہیں۔ شاید یہ والدین کی اچھی تربیت ہی کا اثر تھا کہ بادشاہ نے عالمی شہرت حاصل کی۔ وہ کسی ملک کے بادشاہ نہیں بلکہ انسان دوست دلوں کے بادشاہ ضرور تھے۔
بادشاہ خان سلامت باد۔

جنگِ آزادی کے مشہور مجاہد اور خلافت تحریک

ہندوستان میں بادشاہ خان کے ہم عصر ایسے بہت سے مسلمان لیڈر ہوئے ہیں جو خلافت تحریک سے وابستہ تھے اور کانگریس کے ساتھ تھے۔ اصل میں ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۲۲ء کا زمانہ ہی ایسا تھا جس میں خلافت تحریک نے ہندوؤں کے ساتھ اپنی خلافت بھول کر کانگریس کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کام کیا تھا لیکن

گاندھی جی کی انگریزوں کے ساتھ سمجھوتے کی اطلاع وائسرائے کو کرکے
ستیہ گرہ کرنے کی اور بعد میں ستیہ گرہیوں نے گورکھپور کے تھانہ
چوری چورا کو جلا دیا۔ جس کے ساتھ چند سپاہی بھی جل مرے تھے۔
ستیہ گرہ بند ہونے سے ملک کے سبھی لیڈروں نے کانگریس کا ساتھ
چھوڑ دیا تھا۔ کانگریس کی تحریک بند ہو گئی مگر خلافت کی تحریک
چلتی رہی تھی۔ اس خلافت تحریک کے بانی ملک کے مولانا شوکت
علی اور محمد علی جیسے دُور اندیش، تعلیمیافتہ اور جوشیلے لیڈر
تھے۔ ملک کی آزادی کے علمبردار رہے، کسی سمجھوتے کے لئے کبھی
تیار نہیں تھے۔ مولانا محمد علی کو غلامی سے اس قدر نفرت تھی کہ وہ
ہندوستان جیسے غلام ملک میں مرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ ان کا مزار
بیت المقدس میں ہے آزاد ملک ولایت ہی میں انتقال فرمایا تھا۔
انہوں نے ۱۹۲۲ سنہ کی

کانگریس کی صدارت بھی کی تھی۔ ۱۹۲۲ سنہ میں خلافت کانفرنس
کی صدارت مہاتما گاندھی نے کی تھی۔ کیونکہ اس وقت یہ دونوں ہی
جماعتیں آپس میں شیر و شکر بنی ہوئی تھی۔

خلافت اصل میں ایک مذہبی تحریک تھی جو ترکی کو مدد پہنچانا
چاہتی تھی۔ ترکی (Turkey) جس کے انگریزوں نے ۱۹۱۴ سنہ
کی جنگ فتح کرکے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔ کیونکہ ترکی نے ۱۹۱۴ سنہ میں
انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی تھی۔ مہاتما گاندھی نے اس تحریک کو
سیاسی رنگ دے دیا کیونکہ خلافت اور کانگریس دونوں ہی
انگریزوں کی دشمن تھی اور انہیں ملک بدر کر دینا چاہتی تھیں جب
ان دونوں کا نصب العین ایک تھا پھر دونوں تحریکیں مل کر کیوں نہ
کام کریں۔ خلافت اور کانگریس کا ساتھ کچھ ہی عرصے تک قائم
رہ سکا کیونکہ گاندھی جی کی نرم اور کمزور پالیسیوں کے باعث اسے
الگ ہو جانا پڑا تھا۔ خلافت آندولن کے اس وقت کے یہ اراکین

تھے۔ مولانا محمد علی - مولانا شوکت علی - ڈاکٹر مختار احمد انصاری،
آپ نے سنہ ۱۹۲۷ء میں کانگریس کی صدارت کی تھی۔ ڈاکٹر سیف الدین
کچلو (ان کا ذکر ہو چکا ہے) مولانا حسرت موہانی، اور حکیم اجمل
خاں وغیرہ۔ حکیم اجمل خاں جن کو لوگ مسیح الزماں بھی کہتے ہیں۔
گاندھی جی کے مداحوں اور پیروکاروں میں سے تھے۔ آپ نے بھی
کانگریس کی صدارت کی تھی۔

دیگر مشہور مجاہدین جنگِ آزادی اور بادشاہ خان کے ہمعصر خلافت
اور کانگریس کے پیروکار تھے۔

محمد میاں انصاری، سید سراج الدین، مولانا انصار احمد، مولانا حسین احمد
مولانا سجاد بہاری، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، فیروز، صدر الدین منصور
اور مظفر احمد وغیرہ ان تمام لیڈروں نے بھی ملک کی آزادی کے لیے مصیبتیں
اٹھائی تھیں اور جیلوں کو آباد کیا تھا۔

مشہور مُجاہد جنگِ آزادی سیّد فدا حسین

سیّد فدا حسین سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے مشہور
مجاہد ہیں۔ جناب فدا حسین اٹوا پیریا تحصیل محمدی ضلع کھیری (اترپردیش)
کے باشندے تھے۔ آپ نے پہلی جنگ آزادی سنہ ۱۸۵۷ء میں نمایاں
حصہ لیا تھا اور نواب واجد علی شاہ اودھ کی حمایت میں صف آرا
ہوئے تھے۔

سید فدا حسین نواب اودھ کی فوج کے ایک رجمنٹ کے
رسالدار (کپتان) تھے۔ یہ رجمنٹ محمدی ضلع میں تیناتھ محمدی نوابی
عہد حکومت میں ضلع کھیری کا ہیڈ کوارٹر تھا کھیری نواب اودھ
کی سلطنت کا بارہواں ضلع تھا، اور یہ سلطنت کا سرحدی
ضلع تھا۔ آگرہ بھی سرکار برطانیہ کے قبضے میں تھا۔ بعد کو انگریزوں
نے آگرہ اور اودھ کو ملا کر ایک صوبہ بنا دیا جو آگرہ، اودھ کے

نام سے مشہور ہوا اور آزادی حاصل ہونے کے بعد یہی اتر پردیش کہلایا۔ انگریزی حکومت کی جانب سے صوبہ اودھ کی راج دھانی لکھنؤ پر جون ۱۸۵۷ء میں حملہ ہوا۔ نواب صاحب کی فوج کو شکست ملی۔ انگریزوں نے نواب واجد علی شاہ کو معزول کر دیا اور انہیں کلکتہ کے مٹیا برج میں نظر بند کر دیا۔ گذارے کے لئے پنشن دی اور اودھ کے صوبہ کو انگریزی حکومت میں شامل کر لیا۔

عیاش اور آرام طلب نواب واجد علی شاہ کی ایک بیگم حضرت محل کو انگریزوں کی غلامی بڑی شاق گذری اور وہ بھی بغاوت پر آمادہ ہو گئیں۔ حضرت محل نے زیر حکومت راجاؤں، تعلقہ داروں سے مدد لی اور جو فوج اب بھی لکھنؤ میں ان کے زیر اثر تھی اس کو جمع کیا اور پھر انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ خوں ریز جنگ کے بعد انگریز فوج کے پہلے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ لیکن انہیں اور کمک مل گئی تو ان کی طاقت بڑھ گئی۔ ویسے بھی انگریزوں کے پاس اچھے قسم کے اسلحہ فراواں تھے۔ انگریزی حکومت کی طرف سے لکھنؤ میں ایک ریزیڈینٹ رہا کرتا تھا، اور اس کا دفتر ریزیڈنسی کہلاتی تھی۔ وہ کافی بڑے رقبہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں کچھ انگریزی فوج بھی رہتی تھی۔

بیگم حضرت محل نے اسی ریزیڈنسی پر حملہ کیا اور تمام انگریزوں کو قتل کروا دیا۔ سید فدا حسین کو کانپور کی جانب بھیج دیا گیا تاکہ کسی انگریزی فوج کو لکھنؤ کی طرف نہ آنے دیں۔ اس لئے فدا حسین صاحب نے اب کانپور محاذ کو سنبھال لیا تھا، اور انہوں نے فوری طور پر انگریزی فوج کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔

جب انگریزی فوج نے لکھنؤ پر دوبارہ زبردست حملہ کیا تو اب جناب فدا حسین صاحب کو بھی کانپور کے محاذ پر سے واپس لکھنؤ بلا لیا گیا۔ انگریزوں کے خلاف سخت مورچہ بندی کی گئی اور سخت لڑائی بھی لڑی گئی مگر سخت شکست کے علاوہ کچھ ہاتھ

نہ لگا۔

بیگم حضرت محل نے لکھنؤ چھوڑ کر آزاد ملک نیپال کا رخ کیا وہاں بھی انہوں نے نانا صاحب پیشوا کے ساتھ مل کر انگریزوں پر حملہ کیا تھا مگر وہاں بھی شکست ہی ملی۔ یہاں بھی ان کے ساتھ رسالدار فدا حسین خاں تھے۔

لکھنؤ میں انگریزوں نے سینکڑوں باغیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا اور ہزاروں کو گولیوں سے اڑا دیا۔ چونکہ فدا حسین صاحب بیگم حضرت محل کے ساتھ نیپال چلے گئے تھے اس لئے پھانسی سے بچ گئے۔ لیکن ان کی تمام املاک جو لکھنؤ یا کھیری میں تھی ضبط کر لی گئی تھی۔ تعلقداری چھین لی گئی اور وہ تباہ و برباد ہو گئے۔

جمعیت العلمائے ہند اور کانگریس

خلافت کے جسم میں جمعیت العلماء ہند دماغ تھی۔ یہ جماعت خلافت تحریک کی رہنمائی کرتی تھی، اور کانگریس کے ساتھ اس کا تعاون تھا۔ اس کی بنیاد مولانا عبدالباری فرنگی محل والے نے ڈالی تھی۔ یوپی کا دیوبند اس کا مرکز تھا۔ مفتی کفایت اللہ، مولانا آزاد۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اس جماعت کے روشن ستارے تھے۔ یہ جماعت چونکہ علماؤں کی تھی۔ اس لئے وہ مسلمانوں کی قومی اور سیاسی رہنمائی کرتی تھی۔ اس کا کام سبھی قومی لیڈروں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر لا کر کھڑا کر دینا بھی تھا تاکہ سب مل کر ملکی آزادی کے لئے تعاون سے کام کریں۔ اس جماعت کے خاص الخاص رکن حسین احمد مدنی نے اسے کانگریس کے بہت قریب لا دیا تھا۔ یہ جماعت اب بھی ہے اور پہلے سے بھی زیادہ ترقی پر ہے اور علم کی شاہراہ ہے۔ کہتے ہیں کہ کانگریس کا جلسہ ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں ہوا تھا اس میں گاندھی جی کی عدم تشدد تحریک پاس کی

گئی تھی ۔ اس وقت جمعیت العلماء نے مسلمانوں کیلئے یہ فتویٰ بھی جاری کیا تھا کہ ہندوستان کے ہر مسلمان کا یہ مذہبی اور سیاسی فرض ہے کہ وہ کانگریس کی تحریک کے ساتھ تعاون کرے اور سرکاری اسکولوں ۔ کالجوں ۔ کچہریوں اور خطاب وغیرہ کا بائیکاٹ کرے ۔ اس فتویٰ پر ۹۰۰ علماؤں کے دستخط ہوئے تھے ۔

سنہ ۱۹۲۱ء کے اپنے جلسہ میں خلافت کانفرنس نے یہ تجویز بھی پاس کی تھی ۔ وہ یہ تھی ......

"ہر نظریہ ہے
مسلمانوں کے لیے شرم کی بات ہے کہ وہ برٹش فوج کی نوکری کرتے رہیں یا فوج میں بھرتی ہوں ، یا دوسروں کو فوج میں بھرتی ہو جانے کی ترغیب دیں مسلمانوں کا اور خاص طور پر علماؤں کا یہ فرض ہے کہ یہ مذہبی احکامات ملک کے ہر مسلمان تک پہنچے"

جامعہ ملیہ اسلامیہ

سنہ ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ کی بنیاد علیگڈھ میں رکھی گئی تھی ۔

مولانا محمود الحسن ، مولانا محمد علی ۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ، خواجہ عبد الماجد اور مولانا ابو الکلام آزاد اس ادارے کی بنیاد رکھنے والوں میں ہیں ۔ اس ادارے کا مقصد طلباء کو قومی تعلیم دینا تھا ۔ انہیں قومی خدمت کے لیے تیار کرنا تھا ۔ یہ ادارہ ویسا ہی تھا جیسا کہ لالہ لاجپت رائے نے انہیں ایام میں لاہور میں قائم کیا تھا ۔ ان اداروں میں تعلیم پاکر طالب علم مجاہد جنگِ آزادی بنتے تھے ۔ قومی کام کے لیے قومی تعلیم کا ہونا بھی بہت ضروری ہے ۔ اس ادارے کا نام نیشنل کالج تھا ۔ بنارس ہندو یونیورسٹی اور علیگڈھ کی مسلم

یونیورسٹی نے اپنی تعلیم کے ذریعہ نہ جانے کتنے جنگ آزادی کے مجاہدین کو پیدا کیا تھا۔ مولانا حسرت موہانی جیسے مجاہد جنگ آزادی نے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں ہی تعلیم پائی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین بھی اسی یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ یہ یونیورسٹی بنارس کی ہندو یونیورسٹی کا جواب ہے۔ تعلیم کے میدان میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور پنڈت مدن موہن مالویہ کا کوئی جواب نہیں ہے۔ یہ دونوں حضرات مشہور مجاہد جنگِ آزادی بھی تھے۔

میں نے دیکھا ہے مسلمانوں میں بھی ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر لیڈر ہوئے ہیں۔ وہ جیل نہ بھی گئے ہوں اور شہادت بھی نہ پائی ہو مگر انہوں نے جنگ آزادی میں جو حصہ لیا، یا بے شمار قربانیاں دی ہیں اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کیا یہ امر قابلِ تعریف نہیں ہے کہ جناب عمر سبحانی جو کہ بمبئی کے ایک کروڑ پتی اسامی تھے انہوں نے مہاتما گاندھی کو کورا چیک دے دیا تھا اور کہا تھا: "آپ جتنی رقم چاہیں اس میں لکھ دیں اور کانگریس کے کاموں میں خرچ کریں۔"

انہوں نے ہوم رول کے لئے بہت کام کیا اور ملک کی آزادی کے لئے اتنی زیادہ قربانیاں دی ہیں کہ وہ خود مالی اعتبار سے بالکل تباہ ہو گئے۔

مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا احمد سعید جو کہ جمعیت علمائے ہند کے سرکردہ لیڈر تھے۔ انہوں نے بھی جنگِ آزادی کو تقویت پہنچائی تھی۔ جیل نہ جانے پر بھی وہ مجاہد آزادی ہیں۔

کاش ان سبھی مجاہدینِ جنگِ آزادی کی ایک فہرست مرتب ہوتی۔

شہیدِ جنگِ آزادی سیّد گینو بابو

سید گینو بابو کانگریس کے ایک سچے کارکن تھے۔ انہیں اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی اور اس کی آزادی کے لئے اپنی جان تک دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے نمک ستیہ گرہ شروع کر چکے تھے ۱۲ مارچ کو انہوں نے تاریخی ڈانڈی مارچ کیا تھا اور ۶ اپریل ۱۹۳۰ء کو گجرات کے سمندری ساحل ڈانڈی پر پہونچ کر انہوں نے نمک قانون شکنی سرکاری نمک کے ذخیرے سے ایک مٹھی نمک اٹھا کر شروع کی تھی۔ ۵ مئی کو گاندھی جی کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ان کی گرفتاری کے بعد ملک بھر میں جگہ جگہ نمک کا قانون توڑا گیا۔ بدیشی کپڑوں کی دکانوں پر پکیٹنگ کی گئی اور شراب کی دکانوں پر دھرنا دیا گیا۔ جوشیلے نوجوان سید گینو بابو نے بھی ستیہ گرہ میں نمایاں حصہ لیا۔ محض حصہ ہی نہیں لیا بلکہ اپنی جان تک قربان کر دی۔

یہ دسمبر ۱۹۳۰ء کا مہینہ تھا۔ ستیہ گرہ زوروں پر تھا — بدیشی کپڑوں کی ہولی جلائی جاتی تھی۔ بمبئی کی بدیشی کپڑوں کی دکانوں کو بند کرایا جا رہا تھا۔ بمبئی کے مولجی جیٹھا مارکٹ میں بدیشی کپڑوں سے لدا ٹرک لایا جا رہا تھا۔ کانگریس کے والنٹیر اسے روکنے کے بے چین ہو رہے تھے۔ والنٹیر ٹرک کے مالک سے ہاتھ جوڑ کر اسے واپس لے جانے کے لئے خوشامد کر رہے تھے، لیکن مالک کسی طرح راضی نہیں ہو رہا تھا۔ اس وقت بہادر مجاہد جنگ آزادی سید گینو بابو کے جوش میں ابال آ گیا۔ انہوں نے للکار کر کہا: "ٹرک میرے سینے پر چڑھ کر ہی جا سکتا ہے۔" وہ یہ کہہ کر ٹرک کے آگے لیٹ گئے۔ ٹرک والا بھی ضدی اور بے رحم تھا۔ اس

نے ٹرک کو بابو کے سینے کو کچلتے ہوئے آگے بڑھا ہی دیا۔ ٹرک سے گینو بابو بری طرح کچل گئے۔ زمین ان کے لال خون سے رنگ کر سرخ ہو گئی۔ ان کو فوراً اسپتال لے جایا گیا لیکن موت کے بے رحم ہاتھوں نے انہیں ابدی نیند سلا دیا۔ یہ حادثہ ۱۲ دسمبر ۱۹۳۰ء کو واقع ہوا تھا۔ شہید سید گینو بابو پونہ کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ بمبئی کی ایک سوتی مل میں وہ نوکری کرتے تھے۔ آدمی وطن پرست تھے۔ اس لئے جب ستیہ گرہ شروع ہوا تو اس میں حصہ لینے سے وہ اپنے آپ کو روک نہ سکے۔ جہاں بدیسی کپڑوں کے ٹرک کو روکنے کے لئے انہوں نے اپنی جان دے دی تھی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ آج بھی دیسی کپڑا کم اور بدیسی کپڑا ہی زیادہ بکتا ہے۔ کیا یہ شرم اور افسوس کی بات نہیں ہے۔

کرافورڈ مارکیٹ کے پاس پرنسس اسٹریٹ کی ایک گلی کے نکڑ پر سید بابو گینو کے نام کا ایک بورڈ ان کی قربانی کی یاد دلانے کے لئے لگا ہوا ہے

جنگِ آزادی کے امر شہید باپ اور بیٹا

یہ دردناک واقعہ ہے شولاپور مہاراشٹر کا۔ جبکہ پونہ کی بدنام جیل یرودا میں ۱۲ جنوری ۱۹۳۱ء کو باپ حسن احمد قربان علی اور بیٹا عبد الرسول کو شولاپور کے ملیا دھن سیٹھی، جگناتھ شندے، اور شری کرشن شاردا کے ساتھ پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ ان پر قتل کرنے اور سرکار کے خلاف بغاوت کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔

ڈانڈی مارچ کی واپسی پر مہاتما گاندھی شولاپور کے کرڈی آشرم میں ٹھہرے تھے۔ وہ ۶ اپریل ۱۹۳۰ء کو ڈانڈی مارچ میں نمک کا قانون توڑ چکے تھے۔ اب وہ پبلک کو نمک بنانے کی ترغیب دے رہے تھے۔ بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ کرنے کو کہہ رہے تھے۔

حکومت نے انہیں ورغلانے کے جرم میں ۵ مئی ۱۹۳۰ء کو گرفتار کرلیا۔ دوسرا یہ کہ انگریزی حکومت یہ نہیں چاہتی تھی کہ گاندھی جی ملک بھر میں نمک کا قانون توڑنے کے لئے لوگوں کو تیار کریں — جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کو پہلے ہی گرفتار کیا جاچکا تھا۔ مہاتما گاندھی کی گرفتاری نے شولاپور میں شعلہ سا بھڑکا دیا شہر میں چاروں طرف غم و غصہ کی فضا پیدا ہوگئی۔ لوگوں نے جلوس نکالے۔ میٹنگیں کیں۔ سرکار کے خلاف جوشیلے نعرے لگائے — سرکار نے ۶ مئی کو لاٹھی چارج کیا اور گولی چلائی اس سے حالت اور زیادہ بگڑ گئی۔ پبلک گاندھی جی کا عدم تشدد کا سبق بھول گئی — اور تشدد پر آمادہ ہوگئی۔ اس کے پاس کوئی اسلحہ تو نہیں تھا مگر اینٹ پتھروں کی کمی نہیں تھی۔ پبلک نے پولس پر اینٹ پتھر پھینکے جس سے بہت سے پولس والے زخمی ہوگئے۔ پولس نے جوں جوں علاج کیا مرض بڑھتا ہی گیا۔ بپھری ہوئی پبلک نے کئی سرکاری عمارتوں کو آگ لگادی اور تین پولس والوں کو جلتی آگ میں جھونک بھی دیا۔ پولس نے اب فوج کی مدد لی اور شولاپور میں مارشل لاء نافذ کردیا گیا۔ جو بھی اپنے مکان سے باہر نکلے اسے گولی ماردینے کا حکم دے دیا گیا۔ یہ دونوں باپ بیٹے اپنے کام میں پیش پیش تھے۔

ان لوگوں نے جنگل ستیہ گرہ بھی کیا تھا۔ جنگلات محکمے کے بنگلے کو آگ لگادی تھی۔ کئی دنوں کے بعد سرکار شولاپور کو پھر سے اپنے قابو میں لاسکی تھی۔ اب گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا گولی کھاکر کچھ لوگ پہلے ہی شہادت پاچکے تھے۔ پولس کی لاٹھیاں کھاکر اپنے سر تڑواچکے تھے۔

عبدالرسول۔ قربان علی کو ملیا دھن سیٹھی۔ جگناتھ شندے، اور شری کرشن شاردا کے ساتھ گرفتار کیا گیا تھا۔ ان سب پر بغاوت کا، آگ زنی اور قتل کا مقدمہ چلا۔ کیونکہ ایک سب انسپکٹر

بھی قتل ہو چکا تھا۔ عدالت نے ان پانچوں کو موت کی سزا دی دوسرے دن تین مجاہدوں کے ساتھ باپ قربان علی اور بیٹا عبدالرسول کو بھی ۱۲ رجنوری ۱۹۳۱ء کو یرودا (پونہ) کی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

اگست ۱۹۴۲ء کا خونیں انقلاب

پہلے ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اگست ۱۹۴۲ء کا انقلاب کیا تھا اور وہ کیوں لایا گیا۔ اس کا سیدھا سا جواب ہے کہ اب تک کانگریس یا مہاتما گاندھی نے جتنے بھی وطن کی آزادی کے لیے آندولن چلائے تھے وہ سب ناکامیاب ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کا اور ملک کے انقلابیوں کا ایک بڑا طبقہ کانگریس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ کیونکہ وائسرائے سے پوچھ پوچھ کر، اور اجازت حاصل کر کے یا اسے پہلے سے اطلاع کر کے اپنی آزادی کی تحریک نہیں چلاتا تھی۔ بلکہ گاندھی جی کے بار بار انگریزی سرکار سے سمجھوتہ کر لینے سے بھی لوگ نالاں تھے۔ جوشیلے نوجوان انقلابی سر جھکا کر انگریزوں کی لاٹھیاں اور گولیاں کھانے کو بزدلی سمجھتے تھے۔ سر سے کفن باندھ کر انگریز سرکار سے مقابلہ کرنا مجاہدین کا نصب العین تھا۔

مہاتما گاندھی جی تو مکمل آزادی کا پرستاو تک پاس ہونے نہیں دے رہے تھے۔ وہ تو صرف اس بات سے ہی خوش ہو جانے والے تھے کہ ہم آزاد بھی ہوں تب بھی ہمارے سروں پر انگریزوں کا سایہ بنا رہے۔ چکبستؔ کے اس شعر کو میں پھر لکھتا ہوں۔

؎ طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے،
نہ لیں بہشت بھی ہم ھوم رول کے بدلے!

ملک کی آزادی کی بڑھتی ہوئی مانگ نے اور دوسری عالمی جنگ کی فضا نے ملک کو بے چین کر دیا تھا۔ کیونکہ دشمن

سے اپنی نجات کا بھی یہ ایک سنہرا موقعہ تھا۔ انتشار اور بے چینی نے گاندھی جی کو ۱۹۴۲ء کے انقلاب کے لئے مجبور کر دیا تھا۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس گوالیا ٹینک (بمبئی) کے میدان میں ۸ر اگست ۱۹۴۲ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں "انگریزو بھارت چھوڑدو" کی تجویز پاس کی گئی اور گاندھی جی نے دس بجے شب کو نعرہ "کرو یا مرو" کا اعلان کیا۔ گاندھی جی کے اس نعرے کے معنی لوگوں نے اپنے اپنے طریقے سے لگائے۔ کیونکہ گاندھی جی نے کبھی صاف الفاظ میں یہ بات خلاصہ سے نہیں کی تھی کہ ٹیلی فون کے تار کاٹو، ریل کی پٹریاں اکھاڑو، سرکاری عمارتوں کو آگ لگاؤ، عالمی جنگ کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرو۔ ہوشیار گاندھی جی ایسا کہہ کر پھانسی پر چڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے وہ مجبور تھے۔ دوسرے دن ہی ان کو اور دیگر لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ جیل میں جاکر جب گاندھی جی نے دیکھا کہ ملک میں بغاوت ہوگئی ہے تو انہوں نے کہہ دیا کہ ۱۹۴۲ء کی تحریک ان کی نہیں ہے۔ انہوں نے تو پبلک سے صاف کہہ دیا تھا کہ "تم جانو اور تمہارا کام جانے۔" تم جاکر "کرو یا مرو"، مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔ سرکار نے سب سے بڑی غلطی یہ بھی تو کی ہے کہ اس نے تمام ملک کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا ہے۔ جب جنتا کو صحیح راستہ بتانے والا کوئی لیڈر جیل کے باہر نہیں رہا تو اس کی سمجھ میں جو آیا اس نے وہی کیا۔ اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے؟ پونہ کے آغاخان محل کو جیل کہنا تو محل کا مذاق اڑانا ہے۔ خیر وہ اسی جیل سے وائسرائے کے ساتھ برابر خط و کتابت کرتے رہے، اور جب اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو انہوں نے اپنے پرانے حربے کا سہارا لیا یعنی برت (فاقہ کشی) شروع کر دی۔ اس محل کے اندر جہاں ان کی بیوی کستوربا بائی اور ان کے پرائیویٹ سیکریٹری مہادیو دیسائی انتقال فرما چکے تھے۔ سرکار گاندھی جی

کو مار ڈالنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس سے بغاوت اور زیادہ تیزی کے ساتھ بھڑک اٹھنے کا اندیشہ تھا لہٰذا سرکار نے گاندھی جی کو رہا کر دیا۔ جبکہ ہزاروں افراد جیل کی روٹیاں کھاتے رہے۔ بار بار گرفتار ہوتے رہے۔ جیل جاتے رہے۔

مسلمانوں نے اس تحریک میں بہت کم حصہ لیا تھا جس کی وجہ گاندھی جی کی پالیسی تھی۔ اس کے باوجود ملک کی آزادی کے لئے بہت سے مسلمان جیل گئے اور شہید بھی ہوئے تھے۔

سون پور (بہار) کا شہید تجمل حسین

سون پور ضلع چھپرا (بہار) کا ایک قصبہ ہے۔ اگست انقلاب کی خبر ۱۵ اگست کو سون پور پہنچی تو یہاں کے لوگوں نے ایک میٹنگ کی اور جناب مہیشور سنگھ کی سرکردگی میں لوگوں کا ایک بڑا جلوس توڑ پھوڑ کرنے کے خیال سے سون پور اسٹیشن گیا۔ باغیوں نے ریل کی پٹریاں اکھاڑیں، ٹیلی فون کے تار کاٹے۔ اناج سے بھرے ایک گودام کو جلا دیا۔ پولس نے باغیوں کے ایک بڑے مشتعل ہجوم کے سامنے اپنے اسلحے ڈال دیئے۔ باغیوں میں سے بہت سے لوگ ریلوے کا مال لوٹ کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ لوگوں کو مال لے کر بھاگتے دیکھ کر پولس نے گولی چلا دی۔ جلوس کے لیڈر مہیشور سنگھ نے باغی پبلک کو بھاگنے سے روکا بھی، مگر اب ان کی کون سنتا تھا۔؟ ایک گولی کھا کر وہ بھی شہید ہو گئے۔ ان کے ساتھ شہید ہونے والوں میں ایک مجاہد آزادی جناب تجمل حسین بھی شہید ہوتے تھے۔

آپ سون پور کے رہنے والے تھے۔ آپ بھی اس دن جلوس کے ساتھ اسٹیشن گئے تھے اور جناب مہیشور سنگھ کے ساتھ ہی تھے۔ جب آپ کو گولی لگی اس وقت آپ ریل کی پٹریوں کو پار کر رہے تھے۔ گولی کھا کر آپ ریل کی پٹریوں پر ہی شہید ہوئے تھے۔

سمستی پور کے شہید میر عبداللہ اور عبدالشکور

۹ اگست ۱۹۴۲ء کو لیڈروں کی گرفتاری کی گاندھی جی کے "کرو یا مرو" نعرے کی خبر جب سمستی پور ضلع دربھنگہ (بہار) پہونچی تو یہاں کی پبلک بھی بغاوت پر آمادہ ہو گئی اور اس نے بھی توڑ پھوڑ کرنا شروع کر دیا تھا۔ توڑ پھوڑ کا کام یہاں بھی ۱۵ اگست ۱۹۴۲ء کو شروع ہوا تھا۔ گوروں کو لئے ہوئے ایک ٹرین سمستی پور اسٹیشن پر آکر رکی۔ ان کو دیکھ کر پبلک نے " انگریزو بھارت چھوڑو " انقلاب زندہ باد " کے نعرے بلند کئے۔ دو تین گورے، گاڑی سے اتر کر اس پھاٹک پر گئے جہاں بھیڑ جمع تھی، اور انہوں نے ان پر بے تحاشہ گولی چلانا شروع کر دیا۔ گوروں کی اسپیشل ٹرین جب آگے بڑھ کر پھاٹک کے قریب پہونچی تو ان گوروں نے پھاٹک کھول دیئے اور خود گاڑی پر سوار ہو گئے۔ انہوں نے بھیڑ پر سوڈا واٹر کی ایک بوتل پھینک دی تو پبلک آپے سے باہر ہو گئی۔ اور ٹرین پر اینٹ پتھر پھینکنا شروع کر دیا۔ بس پھر کیا تھا فوجی افسر نے خطرے کی سیٹی بجا دی اور فوراً گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ گولی کھا کر بہت سے زخمی ہوئے اور بہت سے شہید بھی ہو گئے تھے۔

ان شہیدوں میں دو مسلمان بھی تھے۔ ایک جناب میر عبداللہ اور جناب عبدالشکور۔

دھمدا ہا کا شہید شیخ اسحٰق

دھمداہا (بہار) میں جب بمبئی میں ۸ اگست ۱۹۴۲ء کے نعرے کی گونج پہونچی تو وہاں کی پبلک نے ایک جلسہ کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ

۲۵ر اگست سنہ ۱۹۴۲ء کی تمام تھانوں پر کانگریس کا ترنگا جھنڈا چڑھا دیا جا ئے۔ قریب بیس ہزار باغیوں کا ایک جلوس دھمداہا (ضلع پورنیہ بہار) کی طرف "انقلاب زندہ باد" نعرے لگاتے ہوئے بڑھ چلا۔
دھمداہا تھانہ کے تھانے دار سے باغی پبلک نے تھانہ خالی کرنے کا، کل اسلحہ ان کے سپرد کرنے کا اور تھانہ پر آزادی کا پرچم لہرانے کا تقاضہ کیا۔ ہوشیار تھانے دار ادھر ادھر کی باتیں کرکے وقت ضایع کرتا رہا۔ لیڈران تھانہ کی بندوقوں کو مال گودام میں بند کرکے اپنا تالا لگا دینا چاہتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک پولس انسپکٹر پورنیہ ضلع سے مسلح پولس کا دستہ لے آیا۔ اب تو تھانے دار بکری سے شیر بن گیا اور اس نے بھیڑ پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔
زخمیوں کا شمار نہیں ہو سکا۔ شہیدوں کا شمار لگایا گیا جو تعداد میں ۴۰ تھے۔ انہیں شہیدوں میں دھمداہا کے شیخ اسحاق نے بھی اپنا خون شامل کر دیا تھا۔ اس طرح سے ۲۵ر اگست سنہ ۱۹۴۲ء کو شیخ اسحق نے ایک شہید کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔

سنکری گولی زنی کے شہید حاتم علی

سنکری ضلع شاہ آباد (بہار) کا ایک قصبہ ہے۔ یہاں ایک کھادی بھنڈار بھی ہے۔ ۱۹۴۲ء کی خونی تحریک میں جن مسلمان بہادروں نے دل کھول کر حصہ لیا تھا۔ انہیں بہادر مجاہدوں میں حاتم علی کا شمار ہوتا ہے۔ بمبئی کی خبر پاکر یہاں بھی توڑ پھوڑ کی گئی تھی۔
۱۹ر اگست سنہ ۱۹۴۲ء کو مسلح پولس کا ایک دستہ زیر نگرانی ایک مجسٹریٹ کے سنکری پہنچا۔ کچھ جوشیلے نوجوانوں نے پولس کی دو رائفلیں چھین لیں۔ ایک بندوق حاتم علی نے چھینی تھی۔ اس بندوق کو انہوں نے کھادی بھنڈار میں لے جا کر چھپا دی تھی۔ اسی بھنڈار

میں وہ رہا بھی کرتے تھے۔

۱۹ر اگست میں انقلابیوں کا جوش جب اُبال پر تھا تو پولس اس جوش کو ٹھنڈا کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ فرنگی ظلم وستم پر اتر آئے تھے۔ جگہ جگہ تلاشیاں اور گرفتاریاں ہو رہی تھیں، گولیوں سے باغیوں کو بھونا جا رہا تھا۔ پولس کی رائفلوں کا چھین جانا معمولی بات نہ تھی۔

۲۰ر اگست ۱۹۴۲ء کو ٹامیوں کے ایک دستے نے آکر، کھادی بھنڈار کا محاصرہ کر لیا۔ حاتم علی اس کوٹھری میں جا چھپے تھے جس میں رائفل رکھی ہوئی تھی۔

حاتم علی کے ساتھ اس کوٹھری میں کھادی بھنڈار کا ایک کارکن شری کیلاش بہاری مصر ایلی تھے۔ کوٹھری میں اندر کی زنجیر نہیں تھی۔ دونوں نے اپنی طاقت سے دروازہ بند کر رکھا تھا۔ ٹامیوں نے آکر کوٹھری کے دروازے پر زور زور سے دھکے دیئے اور یہاں تک دھکے مارے کہ دروازہ ٹوٹ کر ان دونوں پر جا گرا۔ حاتم علی کے ہاتھ میں بغیر گولی کی رائفل تھی۔ جس میں سنگین لگی ہوئی تھی۔ اسی سے انہوں نے ایک پولس افسر کو زخمی کر ڈالا۔ اب اس نے گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ ٹامیوں نے گولی چلا کر اس بند کوٹھری میں دونوں کو سخت زخمی کر دیا۔ حاتم علی کی رائفل چھین لی گئی۔ کیلاش بہاری مصر ایک گوشے میں بیہوش پڑے ہوئے تھے، اور حاتم علی کئی گولیاں کھا کر شہید ہو چکے تھے۔ ٹامی حاتم علی کی لاش کو ایک صندوق میں بند کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ گاؤں والوں نے دوسرے دن بہادر وطن پرست نوجوان حاتم علی کا ایک ماتمی جلوس نکالا اور بعد میں کھادی بھنڈار کے ہی احاطے میں ان کی یادگار میں ایک قدِآدم مجسمہ کھڑا کیا جو حاتم علی کی قربانیوں کی لوگوں کو یاد دلاتا رہتا ہے۔

پیرپینتی گولی زنی کا شہید جمراتی

پیرپینتی ضلع بھاگل پور بہار کا ایک ایسا گاؤں ہے جس میں ہفتہ وار بازار لگا کرتا ہے۔ ۱۹ راگست ۱۹۴۲ء بازار کا دن تھا۔ پیرپینتی کے وطن پرست باشندوں نے حکومت کے ظلموں کے خلاف ایک جلوس نکالنے اور بعد ازاں ایک میٹنگ کرنے کا ارادہ کیا اور اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے لوگ بازار میں جمع ہونے لگے تھے۔

اپنے ملک میں نہ جے چندوں کی کمی ہے اور نہ میر جعفروں کی۔ میر جعفر کا اپنے سر پر سہرا باندھنے کے لئے تھانہ بھاگا بھاگا گیا اور پولس کو اطلاع کردی۔ فوراً مسلح پولس بازار میں آدھمکی۔ ان پولس والوں نے بازار والوں کو ہی جلوس والا سمجھا اور آتے ہی گولی چلانا شروع کر دیا۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے تو بہت سے شہید بھی ہو گئے ان شہیدوں میں جمراتی میاں بھی تھے۔ گوروں نے تو کل بازار والوں کو ہی باغی سمجھ لیا تھا۔ ظالم گوروں نے ۱۹ راگست ۱۹۴۲ء کو پیرپینتی کے بازار کو شمشان گھاٹ بنا ڈالا تھا۔ جمراتی میاں نے بھی اپنی شہادت دے کر شہیدوں میں نام لکھا لیا۔

بلیٹھا گولی زنی کے شہید امیر علی

جناب امیر علی بلیٹھا ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ پٹنہ کے سکریٹریٹ پر سب سے پہلے بہار میں ترنگا جھنڈا لہرایا گیا تھا۔ جلوس میں زیادہ تر اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم تھے۔ ان پر گولیاں چلائی گئی تھیں، اور کئی بچے شہید ہو گئے تھے۔ اس حادثہ

سے تمام بہار میں غم و غصہ کی لہر پھیل گئی تھی۔ بیتھا کے لوگوں کو بھی اس سے صدمہ پہونچا تھا۔

بیتھا گاؤں کے لوگوں نے ایک بڑا جلوس نکالا جس میں قرب و جوار کے لوگ بھی شامل ہوئے، اور یہ جلوس میتھا اسٹیشن کی جانب "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے بڑھا۔ اس جلوس میں طالب علم ہی زیادہ تھے۔ جب یہ لوگ ریلوے پلیٹ فارم پر پہنچے تو ان کو وہاں سے چلے جانے کے لئے کہا گیا۔ مگر جوش میں ہوش کہاں تھا۔ جلوس والوں نے اسٹیشن کے کمروں میں گھسنا اور توڑ پھوڑ کرنا شروع کر دیا۔ اسٹیشن پر گوری فوج کا پہرا تھا۔ اس نے گولی چلا دی۔ ایک گولی کھا کر کم عمر امیر علی وہیں پر شہید ہو گیا۔ امیر علی اور دیگر لڑکوں کی شہادت نے جلوس کو بالکل باغی بنا دیا۔ پھر انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اناج سے بھری ہوئی ایک مال گاڑی کو لوٹ لیا، اور آگ لگا دی۔

ہوائی جہاز کے شہید اکرم علی

ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندوستان کے باہر جن مسلمانوں نے اپنی جانیں قربان کر دی تھیں ان کے بارے میں لوگ کم ہی جانتے ہیں۔ کاش ہم ہر شہید مسلمان کے بارے میں جانتے ہوتے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو ان کی تعداد کم نہیں ہے۔ زیادہ تر یہ مسلمان مجاہد انگریزی فوج میں نوکری کر رہے تھے۔ مگر جب مادر وطن کی خدمت کا موقع آیا اور انہیں اس کے لئے آواز دی گئی تو وہ اس آواز کو ان سنی نہیں کر سکے اور اپنے سر پر کفن باندھ کر آزاد ہند فوج میں شریک ہو گئے تھے۔ اکرم علی بھی انہیں وطن پرست نوجوانوں میں سے ایک وطن پرست نوجوان تھے۔ وہ ۱۹۴۲ء میں ملایا کی انڈیا انڈی پینڈنٹ لیگ کے ممبر تھے۔ وہ بڑی ذمہ داری سے وہاں کام کر رہے تھے۔

مجاہد اکرم علی اپنے تین اور ہندوستانیوں کو لے کر ۱۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو سنگاپور سے بنکاک کے لئے روانہ ہوئے۔ کیونکہ وہاں انڈین انڈی پنڈنٹ لیگ کا ایک جلسہ ہونے والا تھا۔ جناب اکرم علی کو اس میں شامل ہونا تھا۔ لیکن یہ جہاز انہیں لے کر بنکاک نہ پہونچ سکا۔ کیونکہ وہ راستہ ہی میں حادثہ کا شکار ہو گیا تھا۔ اس طیارے کا ملبہ یکم اپریل ۱۹۴۲ء کو ملا اور ۵ اپریل ۱۹۴۲ء کو فوجی عزت کے ساتھ انہیں دفن کیا گیا۔

امر شہید محمد عبدالقادر

امر شہید عبدالقادر ٹراون کور (دکھنی بھارت) کے رہنے والے تھے۔ انگریزی فوج میں نوکری کرنے کے بعد مادر ہند کی پکار پر انہوں نے انگریزوں کی نوکری چھوڑ دی تھی۔ ملایا سنگاپور میں مقیم آزاد ہند فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ تعلیم یافتہ تھے اور خدمت وطن کا جذبہ دل میں رکھتے تھے۔ آزاد ہند لیگ کو ایسے ہوشیار، تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ضرورت تھی جو ہندوستان میں جا کر وہاں کے نوجوانوں کو انقلاب کے لئے تیار کر سکیں۔ دیسی فوج کو بھی غدر کے لئے تیار کر سکیں۔

یہ کام بہت خطرناک تھا۔ عبدالقادر کے سپرد یہی خطرناک کام کیا گیا تھا۔ اور وائرلیس تار کی ٹریننگ دے کر انہیں چند دوسرے نوجوانوں کے ساتھ ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ کل ۲۰ نوجوان تھے جنہیں چار حصوں میں بانٹا گیا تھا۔

وطن پرست نوجوانوں کی ٹولی جو کاٹھیاواڑ کے ساحل پر اتری تھی اس میں جناب عبدالقادر بھی تھے۔ سب پن ڈبی میں آئے تھے۔ جو ساحل سے ۵ میل دور سمندر میں کھڑی کی گئی تھی۔ ۲۱ گھنٹوں تک طوفانی موجوں سے لڑتے ہوئے ایک ربڑ کی کشتی پر سوار ہو کر وہ لوگ ساحل تک پہونچ سکے تھے، اور پہونچے تھے صرف اپنی شہادت دینے کے لئے۔

خطرناک سمندری سفر سے جو پریشانی ہوئی تھی۔ وہ ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ کچھ لوگوں نے ان کی بوکھلاہٹ سے بھانپ لیا اور سی۔آئی۔ڈی پولس کو اطلاع کر دی جو پہلے سے ہی تیار تھی اور ساحل پر اترنے والے ہر مسافر پر کڑی نظر رکھ رہی تھی کیونکہ یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ جناب محمد عبدالقادر اور ان کے تمام ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسے بھی ایک ناگہانی مصیبت اور اتفاق کہنا چاہیئے جن ۱۴ نوجوانوں کو ہندوستان الگ الگ بھیجا گیا تھا۔ ان سب کو ہی پولس نے گرفتار کر لیا تھا اور سب کو ہی لاکر مدراس کے قلعہ میں بند کیا گیا تھا۔

جناب محمد عبدالقادر کو ۸ مارچ ۱۹۴۳ء کو فوجی عدالت کے سامنے ان کے دیگر ساتھیوں کے ساتھ پیش کیا گیا۔ ان پر سرکار کے خلاف بغاوت کرنے کا جرم عائد کیا گیا اور پھر انہیں یکم اپریل کو پھانسی کا حکم سنا دیا گیا اور پھر ۱۰ ستمبر ۱۹۴۳ء کو انہیں اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی کی ان رسیوں میں جھلا دیا گیا جو شہیدوں کے لیے معراج عاشقانِ وطن ہوتی ہیں۔ محمد عبدالقادر مر کر بھی زندہ ہیں کیونکہ شہدائے وطن کبھی مرا نہیں کرتے ہیں۔

جنگ آزادی کا شہید عبداللہؒ

۱۹۱۵ء میں بھی ہندوستان میں انقلاب یا غدر کرانے کی کوشش کی گئی تھی کیونکہ اس وقت انگریز پہلی عالمی جنگ میں الجھا ہوا تھا۔ جس کی سلطنت میں کبھی آفتاب غروب نہ ہوتا تھا اتنی بڑی حکومت سے نجات پانا اسی وقت ممکن ہو سکتا تھا جب وہ لڑائی کی مصیبت میں پھنسی ہو۔ وطن کے انقلابی اندنوں دیسی فوجوں کو اپنی جانب ملا کر ان سے بغاوت کرا دینا چاہتے

تھے۔ لاہور کی ۲۳ ویں رجمنٹ جو سواروں کی تھی بغاوت کے لئے تیار ہو گئی۔ مگر بغاوت کرنے سے پہلے حکومت کو پتہ چل جانے کے باعث غدر پارٹی کی اسکیم فیل ہو گئی اور ۱۸ سواروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان سب کا کورٹ مارشل ہوا۔ ان میں سے ۱۷ کو پھانسی اور ایک کو عمر قید کی سزا ملی۔

بعد کو جب مقدمہ پر نظر ثانی کی گئی تو صرف ۱۲ سواروں کو موت کی سزا بحال رہی۔ ان بارہ سواروں میں ہی جناب عبداللہ تھے۔ اپنے وطن کو غلامی سے نجات دلانے والے یہ ۱۲ سوار اپنے کو موت سے نجات نہ دلا سکے۔

ان سب کو ۳ ستمبر ۱۹۱۵ء کو امبالہ کی جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ان کے ساتھ ہی وطن پرست عبداللہ نے بھی اپنا خون ملا دیا تھا۔

پشاور کا نوجوان شہید عبدالرشید

نوجوان عبدالرشید پر نوجوان بھارت سبھا کے انقلابیوں کا اثر تھا۔ انگریزوں سے اسے دلی نفرت تھی جنہوں نے اس کے ملک کو غلام بنا لیا تھا۔ اور اس پر ظلم کر رہے تھے۔ اس کے پاس پستول یا ریوالور کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ لہذا اس نے ایک تیز دھار والے بڑے چاقو سے کام لیا اور اپنا غصہ نکالا۔

عبدالرشید کی عمر ۲۲ سال تھی۔ دل میں اس کے کچھ کر گذرنے کا ارمان تھا۔ وہ پشاور کے ریڈنگ اسپتال میں ایک ہڈولی کے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ اس نے انگریز سول سرجن کولڈاسٹریم کو نشانہ بنایا اور ایک روز آپریشن تھیٹر کے باہر سول سرجن کے نکلتے ہی عبدالرشید ان پر ایک شیر کی طرح جھپٹ پڑا اور چاقو کا قاتلانہ وار کر دیا۔ اس نے رشید کو پکڑ لیا۔ مگر رشید جلد ان کی گرفت سے باہر ہو گیا اور

وہاں سے پھاٹک کی جانب بھاگا۔ کچھ لوگ بھی شور سن کر ان کے پیچھے بھاگے اور اسے پکڑ لیا۔ صاحب بھی کچھ دور بھاگے تھے مگر غش کھا کر گر پڑے۔ تھوڑی ہی دیر میں انہوں نے وہیں دم توڑ دیا۔ عبدالرشید پر سول سرجن کے قتل کا کیس چلا اور عدالت نے انہیں ۲۸ ر جولائی ۱۹۳۲ء کو پھانسی کی سزا سنائی، اور یکم ستمبر ۱۹۳۲ء کو عبدالرشید کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔
عبدالرشید نے بخوشی ملک کی آزادی کی خاطر موت کو گلے لگا لیا۔

مُجاہدِ جنگِ آزادی جناب عابد حسن

عابد حسن، نیتاجی سبھاش چندر بوس کے ان وفادار دوستوں میں سے تھے جو ان کے جینے اور مرنے میں ہم قدم رہے۔
انہوں نے سبھاش چندر بوس کے ہمراہ ہزار میل کا سفر طے کیا تھا ایسی حالت میں انہوں نے سفر کیا تھا جب موت کے فرشتے انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔
اگر یوں کہہ لیا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا عابد حسن ہی نے بوس کے ساتھ سفر نہیں کیا تھا بلکہ ان کے ساتھ موت نے بھی سفر کیا تھا۔۔۔ کاش مذکورہ دوست کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم ہوتی۔
نیتاجی سبھاش چندر بوس جرمنی کے کیل نارور (بندرگاہ) سے اپنے عزیز اور وفادار دوست جناب عابد حسن کے ساتھ ۸ر فروری ۱۹۴۳ء کے دن آب دوز کشتی (سب میرین) میں بیٹھ کر ہزاروں میل کا آبی سفر طے کر کے ۲۸ر اپریل ۱۹۴۳ء کو میڈاگاسکر کے ساحل پر خدا خدا کر کے پہونچے تھے۔ یہاں سے وہ لوگ پینانگ ایک ربر کی کشتی میں سوار ہو کر جاپانی آب دوز کشتی میں سوار ہوئے جو ان کو لے کر ۲ر جون ۱۹۴۳ء کو پینانگ پہونچی تھی۔

اور یہاں سے ہوائی جہاز میں سوار ہوکر ۱۳ جون ۱۹۴۳ء کو ٹوکیو پہونچے جو سفر کی آخری منزل تھی۔ آگے جو کچھ گزری اسے خدا جانے میں تو بس اتنا جانتا ہوں عابد حسن مجاہد جنگِ آزادی تھے۔

جنگِ آزادی کے مشہور مجاہد جنرل شاہنواز

جنرل شاہنواز اپنے نام سے اپنے کام سے مشہور ہیں نیتاجی سبھاش چندر بوس نے ہندوستان کے باہر جاکر جو لڑائی ہندوستان کی آزادی کے لیے ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ء تک لڑی تھی اس میں ان کے بہادر اور وفادار جنرلوں میں شاہنواز کا شمار ہوتا تھا۔ وہ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ پہلی عالمی جنگ کا زمانہ تھا۔ دوسری عالمی جنگ جو ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان لڑی گئی۔ اس میں وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے انگریزوں کے خلاف لڑے تھے اور نام پیدا کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خدا نے جنرل شاہنواز کو ملک کی آزادی کے لیے ہی تخلیق کیا تھا۔ انہوں نے اپنے فرض کو بخوبی انجام دیا تھا اور آزادی مل جانے کے بعد بھی وہ ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی ہی قوم کو وقف کر دی۔

جنرل شاہنواز نے دہرہ دون کی مشہور ملٹری اکاڈمی میں ٹریننگ حاصل کی تھی اور وہ ۱۹۳۵ء میں ملٹری میں کمیشنڈ آفیسر ہو گئے تھے۔ جس وقت ان کی فوج ملایا سنگاپور میں تھی انہوں نے مادرِ وطن کی پکار سنی اور ۱۹۴۳ء میں آزاد ہند فوج میں دل و جان سے شامل ہو گئے۔

دوسری عالمی جنگ بھی ۱۹۴۵ء میں انگریزوں نے جیت لی جاپان کے ہار جانے کے بعد آزاد ہند فوج کا ہارنا یقینی ہو گیا۔ کیونکہ جاپان ہی آزاد ہند فوج کا خاص مددگار تھا۔ ۱۳ مئی ۱۹۴۵ء کو

آزاد ہند فوج نے اپنے اسلحہ دشمن کے سامنے ڈال دیئے۔ اس کے عہدیداروں کو قید کر لیا گیا۔ دہلی کے لال قلعہ میں ۱۹۴۶ء میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے پھر سے اپنا بیرسٹری کا جامہ پہن کر اس کیس کے قیدیوں کی پیروی کی تھی۔ اس کیس میں ہندوستان کے بڑے بڑے وکیلوں نے پیروی کی تھی۔ اس کے باوجود وہ کیس ہار گئے اور باغیوں کو سزا ہو گئی۔ شاہنواز خاں کو حبس دوام کی سزا ملی تھی مگر بعد میں رائے عامہ کے رُوبرو سرکار کو جھکنا پڑا۔ یعنی وکلا کی یہ دلیل قبول کر لی گئی کہ تمام کے تمام ملزمان نے انسانی فطرت سے مجبور ہو کر دورانِ لڑائی اپنے وطن کے لئے جان دینا زیادہ بہتر سمجھا..... ایسے [illegible] شں کے موقع پر کچھ بھی ممکن ہے۔ اس ٹھوس دلیل پر سرکار کو مقدمہ واپس لینا پڑا۔ یہ رائے عامہ کی فتح تھی۔

انگریزوں کی فوج کے ساتھ مسلمانوں اور ہندوؤں نے مشترکہ طور پر بغاوت کی تھی، اور وہ فوج میں سے نکل کر آزاد ہند فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ کتنے تو آسام کی ندیوں میں ڈوب گئے تھے، کتنے جنگلوں میں بھوکے پیاسے مر گئے تھے۔ اپنے وطن کی آزادی کے لیے انہوں نے جو قربانیاں دیں ہیں وہ رہتی دنیا تک یاد رکھی جائیں گی......

جنگِ آزادی کے دوران، آزاد ہند فوج کے کچھ شہیدوں کے نام

(نوٹ:۔ شہیدوں کی یہ فہرست مکمل نہیں کی جا سکتی۔ بے شمار شہیدوں کی تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں۔ اُن میں آزادی کی راہ میں بھوک، پیاس سے، راہ کی صعوبتوں سے، یا بیماری سے موت کی نیند سو جانے والوں کو بھی میں "شہید" سمجھتا ہوں جنکے نام معلوم نہ ہو سکے۔ اس کے علاوہ بہتوں کے نام چھوٹ بھی سکتے ہیں۔ یہ فہرست اگلے صفحہ پر)

نمبر	نام	کس شہر کے	عہدہ	کیسے شہید ہوئے
۱	عبدالعزیز	بلند شہر	سپاہی	ہوائی حملے میں
۲	عبدالرزاق	رودہتک	"	"
۳	علی اکبر	گجرات	سوبیٔن	دشمن کی گولی سے شہید ہوئے
۴	علی محمد	لائل پور	"	زخمی ہوکر لکھنو ہسپتال میں
۵	الطاف حسین	امرتسر	سپاہی	برہما کی لڑائی میں شہید
۶	اللہ داد	جھیلم	"	شنگھائی کے ہوائی حملے میں
۷	امر علی	"	گرتدر جنٹ	برما کی لڑائی میں شہید
۸	اے۔بی مرزا	"	"	دشمن کی گولی سے
۹	ایوب خان	پونچھ	حوالدار	امپھال کی لڑائی میں
۱۰	اختیار علی	کپورتھلا	صوبیدار	دشمن سے لڑتے ہوئے
۱۱	امان اللہ	"	نائیک حوالدار	" "
۱۲	عبدالرحمٰن	جھیلم	لینس نائیک	دشمن سے لڑتے ہوئے
۱۳	عبدالرشید خان	"	گرتدر جنٹ	"
۱۴	علی محمد	"	نائیک	"
۱۵	عبدالعزیز	گجرات	حوالدار	"
۱۶	احمد خان	"	لینس نائیک	"
۱۷	اللہ دتہ	"	"	"
۱۸	عبدالخالق	میرٹھ	سپاہی	"
۱۹	علی خان	"	سگنلر	فرانس میں مارے گئے
۲۰	اختیار محمود	"	سپاہی	لڑائی میں شہید ہوئے
۲۱	بشیر احمد	رودہتک	گرتدر جنٹ	"
۲۲	بگا خان	گرگاؤں	نائی	فوت ہوگئے
۲۳	بشیر احمد	سیالکوٹ	سپاہی	لڑائی میں شہید ہوگئے
۲۴	بدرالدین	"	گرتدر جنٹ	"

۲۵	بابو خان	جالندھر	سپاہی	"
۲۶	چراغ خان	کپورتھلہ	لینس نائیک	"
۲۷	دلاور خان	جہلم	نائیک	دشمن سے لڑتے ہوئے
۲۸	دین محمد	کپورتھلہ	سپاہی	امپھال کے قریب
۲۹	فتح خان	جہلم	"	لڑائی میں شہید
۳۰	فضل خان	راولپنڈی	"	"
۳۱	فتح علی	"	حوالدار	"
۳۲	فیروز خان	جہلم	سپاہی	"
۳۳	فتح علی	راولپنڈی	حوالدار	"
۳۴	فتح خان	جہلم	نائیک	"
۳۵	فتح علی		سگنلر	فرانس میں مارے گئے
۳۶	فضل کریم	کپورتھلہ	سپاہی	امپھال کی لڑائی میں
۳۷	فضل محمد	"	"	جو ہار میں بیمار ہو کر
۳۸	فتح محمد	شیر پور	ہیڈ کلرک	لڑائی میں
۳۹	فتح خان	جہلم	لینس نائیک	"
۴۰	فتح علی	"	"	"
۴۱	فضل داد	"	سپاہی	"
۴۲	فرزند علی	جہلم	لینس نائیک	لڑائی میں شہید
۴۳	فضل داد	"	سپاہی	۱۹۴۴ء میں اٹلی میں
۴۴	فتح محمد	روہتک	"	جگار گچھا کے قریب
۴۵	گلاب نور	مردان	"	رنگون کے ہوائی حملے میں
۴۶	غلام خان	گوہاٹی	"	لڑائی میں
۴۷	غلام محمد	کپورتھلہ	"	"
۴۸	گورے خان	"	"	"
۴۹	غلام عیسیٰ خان	امرتسر	"	۱۹۴۴ء میں جرمن فرنٹ میں

۵۰	گلزار خان	لدھیانہ	"	لڑائی میں
۵۱	غلام نبی	گرداس پور	"	"
۵۲	حاتم علی	گجرات	"	سنہ ۱۹۴۲ء میں تپ دق سے اسپتال
۵۳	حسین علی	جھیلم	لینس نائیک	سنہ ۱۹۴۴ء میں اسپتال میں
۵۴	ہدایت اللہ	"	"	لڑائی میں
۵۵	عنایت اللہ	پشاور	نائیک	"
۵۶	ابراہیم	کپورتھلہ	گور ریلا جنٹ	امپھال کے قریب لڑائی
۵۷	امام الدین	کپورتھلہ	خانساماں	امپھال کے قریب "
۵۸	ابراہیم	"	سپاہی	"
۵۹	اسمٰعیل خاں	"	"	بیمار ہو کر اسپتال میں
۶۰	امام الدین	میرپور	"	لڑتے ہوئے
۶۱	ارشد	روہتک	"	"
۶۲	جہانداد	حیدرآباد	نائیک	سنہ ۱۹۴۳ء میں پینانگ کی لڑائی
۶۳	جلال خان	جھیلم	سپاہی	سنہ ۱۹۴۴ء میں برما کی لڑائی
۶۴	جلال الدین	بہادپور	سگنلر	بیمار ہو کر اسپتال میں
۶۵	خدابخش	روہتک	حوالدار کلرک	گولی کھا کر
۶۶	خان محمد	بہادپور	سپاہی	سنہ ۱۹۴۴ء میں لڑائی
۶۷	خوشی محمد	لدھیانہ	"	لڑائی میں
۶۵	خان بیگ	کانگڑہ	سوئیپر	"
۶۶	خان محمد	بھرت پور	خانساماں	ہوائی حملے میں
۶۷	خان باس	کیمبل پور	اسٹور کیپر	فرانس میں
۶۸	خلاص خاں	ہسار	ہیڈ کلرک	لڑائی میں
۶۹	لال خاں	میرٹھ	لفٹنٹ نائیک	لڑتے ہوئے
۷۰	لال خاں	جھیلم	سپاہی	"
۷۱	محمد حسین	"	"	"

۷۲	محمد بنارس	راولپنڈی	حوالدار	"
۷۳	محمد دین	"	رجمنٹ حوالدار	"
۷۴	محمد اکبر	"	سپاہی	"
۷۵	محمد یوسف	کوہاٹ	"	امپھال کی لڑائی
۷۶	محمد علی	روہتک	رجمنٹ	دریا کے کنارے
۷۷	محمد عبدالقادر	قیلان	سویلین	۱۹۴۳ء مدراس جیل میں پھانسی
۷۸	محمد علی	جالندھر	"	امپھال میں بیمار
۷۹	محمد یوسف بھٹی	"	نائیک	برما کی لڑائی ۱۹۴۴ء میں
۸۰	محمد خان	"	سپاہی	"
۸۱	موسیٰ خان	"	بہادر گروپ	۱۹۴۳ء میں لڑتے ہوئے
۸۲	محمد غلام	"	سپاہی	۱۹۴۴ء کی لڑائی میں
۸۳	محمد انور	جہلم	حوالدار	۱۹۴۵ء میں اراکان کی
۸۴	محمد شفیع	"	نائیک بہادر گروپ	لڑتے ہوئے
۸۵	محمد حسین	"	سپاہی	"
۸۶	محمد سیف	الموڑہ	نوکر	گر کر مر گیا
۸۷	محمد فضل	"	حوالدار	بہادر گروپ کا اسپتال میں
۸۸	محمد اسلم	کانگڑا	نائیک	فرانس کی لڑائی
۸۹	محمد علی خان	کانگڑا	حوالدار کلرک	ہوائی حملے میں
۹۰	محمد حسن	جہلم	خانساماں	لڑائی کے درمیان
۹۱	محبوب علی	پونچھ	سپاہی	لڑتے ہوئے
۹۲	مال خان	جہلم	گرنڈر رجمنٹ	"
۹۳	محمد یوسف	"	سپاہی	"
۹۴	محمد الٰہی	جالندھر	سپاہی	لڑتے ہوئے
۹۵	مہربان خان	کرنال	"	ہوائی حملے
۹۶	ممتاز علی	حصار	"	لڑائی میں

۹۷	مبارک علی	کپور تھلہ	"	بیمار ہو کر
۹۸	محب شفیع	لاہور	"	لڑائی میں
۹۹	مجنون حسین	کوہاٹ	سپاہی	بیمار ہو کر
۱۰۰	محمد خاں	جہلم	"	"
۱۰۱	محمد بائل	راولپنڈی	"	"
۱۰۲	محمد اکبر	جہلم	"	لڑائی میں
۱۰۳	محمد بخش	"	"	"
۱۰۴	محمد ایوب	پونچھ	"	"
۱۰۵	محمد یعقوب	ہزارا	"	"
۱۰۶	محمد شفیع	راولپنڈی	"	"
۱۰۷	میر گل	"	"	"
۱۰۸	نور محمد	کپور تھلہ	"	ہوائی جہاز کے حملے
۱۰۹	ناصر احمد	"	"	لڑتے ہوئے
۱۱۰	ننھے خاں	جھند ریاست	"	"
۱۱۱	نیک محمد	جالندھر	گرتدر رجمنٹ	"
۱۱۲	محمد الدین	سیالکوٹ	"	"
۱۱۳	نبی بخش	کپور تھلہ	نائیک	لڑائی میں
۱۱۴	نظام الدین	جالندھر	سپاہی	امپھال میں
۱۱۵	نور محمد	"	"	ہوائی حملے کا شکار
۱۱۶	نور حسین	"	"	۱۹۴۳ء میں بیمار ہو کر
۱۱۷	رحیم	گورکھپور	جمعدار	"
۱۱۸	شبراتی خاں	اجمیر	سپاہی	لڑتے ہوئے
۱۱۹	سید علوی	"	بہادر گروپ	"
۱۲۰	سید رحمٰن	اجمیر	حوالدار	"
۱۲۱	شاد اللہ خاں	کوہاٹ	نائیک	"
۱۲۲	شربت خاں	پشاور	سپاہی	"

۱۲۳	سید غفور	مدراس	لینس نائیک	قیدی تھا، ۱۴ جنوری
۱۲۴	شاہ ضمیر	"	گرینڈ رجمنٹ	برما میں ۱۹۴۴ء میں
۱۲۵	شیر محمد	ہمیر پور	لینس نائیک	لڑائی میں
۱۲۶	سرگند علی	کوہاٹ	سپاہی	لڑائی میں
۱۲۷	سعید اللہ خاں	"	نائیک	"
۱۲۸	سید	ملایا	سپاہی	"
۱۲۹	سید حسن	پونچھ	"	"
۱۳۰	صادق محمد	بھرت پور	"	"
۱۳۱	سلطان	جھنڈ	"	"
۱۳۲	سوہن خاں	شیخوپورہ	"	"
۱۳۳	تاج محمد	مردان	حوالدار	"
۱۳۴	عمر محمد	گرگاؤں	سپاہی	"
۱۳۵	وارث خاں	شیخوپورہ	"	"
۱۳۶	ولایت شاہ	"	"	"
۱۳۷	زبیر احمد	"	سویلین	۲۳ اگست کو پھانسی

مشہور مجاہدینِ جنگِ آزادی خان برادران مدھیہ پردیش

خان اعظم محمد ریاست علی خاں کوٹ ضلع فتح پور (یوپی) کے ایک اعلیٰ خاندان ککھر کیانی کے سردار گھرانے میں بمقام پرتاپ گڈھ پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والدِ محترم کا نام محمد راحت علی خاں جو ایک بڑے زمین دار تھے۔ آپ کے والد کا انتقال آپکے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ ککھر خاندان کے جد اعلیٰ شہاب الدین غوری کے سپہ سالار فلک

ہبیل ہیں۔ جن کا نسب ککھر شاہ کیانی سے ملتا ہے۔

خان محمد نفاست علی خاں کی والدہ کے حقیقی نانا دالی خاں تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے غدر میں یا جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا اس کتاب میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ ریاست علی نے کانگریس اور خلافت کے کاموں میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ وہ ایک اچھے افسانہ نگار اور مضمون نگار تھے۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۸۳ء میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔

محمد ریاست علی خاں کے دوسرے بھائی جو ابھی بقید حیات ہیں مگر بستر مرگ پر ہیں۔ ایک اچھے شاعر ہیں۔ کانگریس، اور خلافت میں کام کیا ہے۔ ان کا الگ سے ذکر ہو چکا ہے۔

ان کے تیسرے بھائی کا نام محمد حفاظت علی خاں ہے۔ یہ بھی کانگریس اور خلافت کے کاموں میں دلچسپی لیتے تھے۔ ان کا شمار کانگریس اور خلافت کے لیڈروں میں ہوتا تھا۔ اپنے بڑے بھائی وراثت علی خاں کی طرح یہ بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ کاشتکار پارٹی کے وہ بانی تھے۔ بہت جوشیلے شخص تھے۔ آپ کا انتقال ۱۷ر مئی ۱۹۷۰ء کو ہو گیا۔

محمد حفاظت علی خاں کے چھوٹے بھائی کا نام محمد نفاست علی خاں تھا۔ یہ بھی کانگریس اور خلافت کمیٹی کے سرگرم کارکن تھے جنگ آزادی میں حصہ لینے کے علاوہ آپ نے بہت سے سماجی کام بھی محبوب نگر دکن میں کئے۔ آپ کا انتقال یکم مارچ ۱۹۶۳ء میں ہوا ہے۔ آپ کے جلوس جنازہ میں بلا لحاظ مذہب و ملت ہزارہا عوام نے شرکت کی، اور سب ہی آپ کے غم میں برابر کے شریک رہے۔ حیدرآباد کے محلہ مشیر آباد رسالہ خورشید شاہی کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

ان چاروں بھائیوں (۱) محمد ریاست علی خاں (۲) محمد وراثت علی خاں (۳) محمد حفاظت علی خاں (۴) محمد نفاست علیخاں

کے نام خلافت کمیٹی میں سنہری حروفوں میں لکھے گئے ہیں۔ کانگریس کمیٹی کے چاروں بھائی بھی اچھے کارکن تھے۔ اس طرح سے مسلمانوں میں مجھے یہ ایک ایسا خاندان ملا ہے جس نے آزادی کے لئے دوسرے مجاہدین کے ساتھ دوش بہ دوش کام کیا ہے۔

مشہور مجاہد جنگ آزادی مرزا حسوبیگ ملیح آبادی

ہماری تاریخ شاہد ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جو غدر ہوا تھا، وہ ہماری پہلی جنگ آزادی تھی اور آزادی کی جنگ میں ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں نے بھی اپنا خون بہایا تھا۔ مسلمانوں نے اپنے کردار سے یہ ثابت کر کے دکھایا تھا کہ ہندوستان ہمارا اپنا وطن ہے اور ہمیں بھی اپنے وطن سے پیار ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب ان دو عظیم قوموں نے مل کر آزادی کی جنگ لڑی تھی تو پھر کامیابی کیوں نہیں حاصل ہوئی۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کے پاس اچھے قسم کے اسلحہ تھے۔ ان کی فوج بھی تربیت یافتہ تھی اور ہمارے سکھ بھائیوں نے انگریزوں کا ہی ساتھ دیا تھا۔ ہندوستان جو سینکڑوں حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ کبھی ایک نہ ہو سکا۔ بہت سے بڑے بڑے راجے۔ مہاراجے۔ تعلقداروں اور زمینداروں نے بھی انگریزی حکومت کا ساتھ دیا تھا۔ بہت سے ضمیر فروشوں نے انگریزوں کی طرف سے جاسوسی کر کے اپنے بھائیوں کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈلوایا تھا۔ انہیں وجوہات سے ہم اس جنگ میں کیا۔ کسی بھی جنگ میں کامیاب نہ ہو سکے۔ قوم کے غداروں کی کسی بھی زمانے میں کمی نہیں رہی ہے۔ لیکن اپنے دل کو سمجھانے کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں پھول ہوتے ہیں وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔

کسی بھی جنگ میں سبھی لوگ محاذ پر نہیں جاتے ہیں۔ لڑنے والوں کی مدد کرنا۔ انہیں رسد پہونچانا۔ گھائلوں کی سیوا کرنا اور فوجی سامان تیار کرنا اور فوج میں لڑنے والوں کے پسماندہ خاندان کے افراد کی دیکھ بھال کرنا۔ یہ لڑائی کا ہی ایک اہم حصّہ ہے۔

جناب حسن علی بیگ عرف چھوٹے بیگ نے ۱۸۵۷ء کی جنگ کے موقعہ پر جو کام کئے ہیں اس پر ہر ہندوستانی کو فخر کرنا چاہیئے۔ غدر کے خاتمہ پر جب انگریز لکھنؤ وغیرہ پر قبضہ کر چکے تھے تو اس کے بعد انہوں نے تمام باغیوں کو سزا دی تھی۔ ہزاروں کو گولی سے اڑوا دیا گیا تو ہزاروں کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ چونکہ ملیح آباد کی تحصیل کے عوام نے بھی غدر میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ اس لئے انگریزوں نے اس قصبہ پر بھی ظلم ڈھائے تھے۔ ان حالات میں جناب حسن علی بیگ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی حفاظت کی تھی اور اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ اس وقت بھی ان میں جوانوں جیسا جوش تھا۔

لکھنؤ فتح ہو جانے کے بعد میجر وال پول کی ماتحتی میں انگریز فوج کو بغرض بندوبست ملیح آباد کا علاقہ سپرد کیا گیا تھا۔ میجر وال پول کے کپتان کو ملیح آباد خاص و نواحی بستیوں کو تاراج کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ان بستیوں کے نام تھے کنول ہار، بختیار پور، بی پناہ، مال اور سیڑھا وغیرہ۔ خاص وجہ یہ بھی تھی کہ دورِ نوابی کے ایک رسالدار بشیر محمد خاں کے دونوں بیٹوں محمد احمد خاں اور محمد نسیم خاں نے جنگ لکھنؤ میں مع علاقہ ملیح آباد کے ٹھاکروں، پٹھانوں اور زمینداروں کے حصّہ لیا تھا اور لکھنؤ کے مشرقی مورچے پر سرگرم تھے۔ اس لئے کپتان بن بری (Ban Burry) نے ملیح آباد کے لئے کوچ کیا تھا۔ اس نے بیتیا ندی کے کنارے اپنا پڑاؤ ڈالا تھا۔

فرنگی فوج کی پیش قدمی کی اطلاع ملتے ہی ملیح آباد میں خوف چھا گیا تھا۔ اس کی فوج میں ۲۳ ویں سکھ رجمنٹ سواروں کے ایک رسالہ اور بھاری توپ خانہ اور گورکھا پیدل دستہ تھا۔ اس کی خبر ملتے ہی ملیح آباد کے رسالدار فقیر محمد خاں نے اپنا گھر خالی کر دیا، اور ملیح آباد سے ۱۵ میل دور شمال میں ایک گاؤں منجھی مڈوانہ چلے گئے۔ ان کے ساتھ اور بہت سے لوگ تھے اور ان کا ارادہ نیپال چلے جانے کا تھا۔ ملیح آباد ویران ہو چکا تھا۔ سب کوئی بھاگ چکا تھا لیکن بہادر اور وطن پرست حسو بیگ نے ملیح آباد خالی نہ کیا اور مع اہل و عیال نوکر چاکر وہیں ڈٹے رہے۔ جو کچھ ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔

ملیح آباد کے خالی ہونے اور صرف حسو بیگ کے پیچھے رہ جانے کا حال جب کریند Cureend کے ٹھاکروں کو معلوم ہوا تو ٹھاکر امراؤ سنگھ نے ۶۰۰ پیادہ پیاسی، ۲۰۰ راجپوت سوار۔ ایک سو برق رفتار اتھے (چھوٹی ہلکی بیل گاڑھیاں) ملیح آباد کے محلہ مرزا گنج جہاں مرزا حسو بیگ کی حویلی تھی پہنچا دیئے۔ حسو بیگ نے اپنا آبائی گھر پھر بھی نہیں چھوڑا مگر بہت سمجھانے بجھانے پر انہوں نے اپنے اہل و عیال کو کریند ٹھاکروں کے رسالے کے ہمراہ بغرض حفاظت ضرور بھیج دیا تھا۔ یہ تھی ہندو اور مسلمان کی یکجہتی کی عملی مثال ۔ جو اب بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔

بوقت رخصت امراؤ سنگھ نے حسو بیگ سے کہا تھا

"مرزا صاحب! کریند کے موضع میں جب تک ایک بھی شخص زندہ ہے، آپ کے ناموس پر آنچ نہ آنے پائے گی۔ آپ کی عزت میری عزت ہے۔ آپ کے اہل و عیال کی حفاظت کرنا ہمارا مقدس فریضہ ہے۔"

حسو بیگ چند جاں نثاروں، وفاداروں کے ساتھ اپنی حویلی میں رہ گئے۔ ۸۰ سالہ عمر میں وہ اپنا آبائی گھر کسی بھی حالت میں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کو یہ بھی فکر تھی کہ منجھی مڈوانہ میں جو لوگ نیپال جانے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ نہیں تھے، اور وہ منتظم بھی نہیں تھے۔ سپاہی مالکوں کو چھوڑ کر فرار ہو رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اطلاع ملی کہ انگریزوں نے شمال کی جانب بھی ناکہ بندی کر دی ہے، اور دریائے گومتی کے شمال مغربی کنارے پر بھاری توپ خانہ لگا دیا ہے۔ یہ جگہ اب بخشی کا تالاب کے نام سے مشہور ہے۔

اس درمیان قصبہ کاکوری کی جانب سے ایک ہرکارہ حسو بیگ کے پاس یہ خبر لایا کہ کاکوری میں اس کے آقا قاضی وصی علی خاں کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا ہے۔ ان کو پھانسی دے کر ان کی لاش کو جلا ڈالا ہے۔ اس کے علاوہ ظفر الدولہ بہادر کے نواسے حادی کو سنگینوں سے بھونک کر ہلاک کر دیا ہے۔ غرضیکہ ایک عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ کپتان بن ہر ملیح آباد سے صرف ۶ میل کے فاصلہ پر دریا بیتیا کے کنارے لاؤ لشکر کے ساتھ خیمہ زن تھا۔ وہ کسی بھی وقت ملیح آباد اور اس کے گرد و نواح کے علاقے کو تاراج کر سکتا تھا۔ چاروں جانب موت ہی موت کا سایہ تھا۔ حسو بیگ کے پاس کاکوری کے ٹھاکروں نے یہ خبر بھیجی کہ دریائے گومتی کے کنارے جو فوج انگریزوں کی تھی۔ باغیوں نے اسے قتل کر ڈالا ہے۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ اب کپتان بن ہر ضرور اس کا انتقام لے گا۔ اس خبر کو سن کر جناب حسو بیگ اپنے ایک وفادار کلو بیگ کو لے کر کپتان بن ہر کے پاس گئے۔ جو اس وقت بڑی ہمت کا کام تھا۔

نوٹ :۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حسو بیگ نے غدر کے وقت

چند انگریز خواتین کی جانیں بچائی تھیں۔ اس لئے انگریز ان سے خوش تھے اور انہوں نے ملیح آباد کو تاراج نہ کرنے کی ان کی التجا قبول کرلی تھی۔ پھر بھی وہ مجاہد جنگ ہیں۔

کپتان بن ہر سے ان کی کیا بات چیت ہوئی اور ان کی رسائی جنرل وال پول تک کیونکر ہوئی یہ کسی کو معلوم نہیں، افواج فرنگ کی پیش قدمی کیوں کر رُکی یہ سوالات ہنوز تشنہ ہیں۔ بہر کیف اس بات کا اعتراف سب کو ہے کہ حسو بیگ نے اپنی جان پر کھیل کر، ملیح آباد کو قتل عام سے بچالیا تھا جبکہ میر جاوی اور میر محمد تقی زائر سے قریبی تعلقات کی بنا پر انگریز حسو بیگ سے متنفر اور مشکوک تھے، اور ان کی تلاش میں تھے۔ حسو بیگ کا دشمن کی فوج کے درمیان چلے جانا ایک دلیری کی بات تھی۔ مگر انہیں تو اپنی جان قربان کر کے دوسروں کی جانیں بچانا بھی مقصود تھا۔ حسو بیگ کے کچھ ایسے بھی تو ساتھی تھے جو ملیح آباد چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ مگر حسو بیگ نے وہ کام کر دکھایا تھا کہ انہوں نے ہزاروں کی جانیں بچالی تھیں۔

حسو بیگ کے خاندان والوں نے ریاستی حکومت کو ملیح آباد میں ایک اسپتال بنانے کے لئے اس شرط پر ایک پلاٹ دیا کہ اس میں مرزا حسن بیگ کے نام کا پتھر نصب رہے گا۔ مرزا حسو بیگ کی نسل ان کے پوتے عابد علی بیگ پر ختم ہوگئی۔

ان کا انتقال ۹۰ برس کی عمر میں ہوا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی مرزا رمضان علی بیگ "ریشمی رومال تحریک" کی ناکامی کے بعد وطن چھوڑ کر وسطِ ایشیاء چلے گئے تھے۔ وہیں وطن سے دُور ان کا انتقال ہوا۔

جنگی بحری جہازوں کے ذریعہ سنہ ۱۹۴۶ء کے شہید

بمبئی کے ساحل پر کھڑے بحری جہازوں کے بیڑے نے ہڑتال کے بعد جو بغاوت کر دی تھی وہ نڑکھڑاتی انگریز حکومت کو ملک بدر کرنے کے لئے آخری گھونسا تھا۔ کیونکہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت محض ہندوستانی افواج کے سہارے پر ٹکی ہوئی تھی۔ اور وہ فوج بغاوت کر دے تب تو انہیں ہندوستان سے چلے ہی جانا تھا۔ یوں تو ہندوستان میں شروع سے آخر تک آزادی وطن کے لئے جتنی بھی تحریکیں چلیں۔ لڑائیاں ہوئیں، انگریزی حکومت نے چالاکی سے، جعل سازی نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی اور اچھے قسم کے اسلحہ کی مدد سے ہمیشہ کامیابی حاصل کی تھی اس کا ثبوت اتنا ہی کافی ہے کہ قریب ڈیڑھ صدی تک وہ ہندوستان کو غلام بنا کر اس پر حکومت کرتے رہے تھے۔ سوال ہے پھر ملک کیوں کر آزاد ہو گیا ؟ ملک کو آزادی چار وجوہات کی بناء پر حاصل ہوئی ہے۔ ان چار وجوہات کو سمجھ لینا اشد ضروری ہے

(۱) سنہ ۱۹۴۲ء کی "کرو یا مرو" کی باغیانہ تحریک جس میں ملک کے انقلابیوں نے حصہ لیا تھا۔

(۲) سنہ ۱۹۴۱ء سے سنہ ۱۹۴۵ء تک نیتا سبھاش چندر بوس کی بغاوت، آزاد ہند فوج کی شہادت۔

(۳) دوسری عالمی جنگ سنہ ۱۹۳۹ء سے سنہ ۱۹۴۵ء تک جس نے انگریزوں کی کمر توڑ دی تھی۔

(۴) فروری سنہ ۱۹۴۶ء کو بحری جہازوں کی بغاوت جس نے انگریزی حکومت کی ٹوٹی کمر پر ایک اور ضرب کاری لگا دی تھی اور انہیں احساس کرا دیا تھا کہ اب ہندوستان چھوڑنے میں ہی ہماری جان و مال کی خیریت ہے۔

مجاہد جنگ آزادی ایم۔ ایس۔ خان

اپنی کچھ سیاسی اور غیر سیاسی مانگوں کو لے کر جب بحری جنگی جہازوں کے بیڑے نے ۱۹ر فروری ۱۹۴۶ء کو ہڑتال کر دی، تو ہڑتالیوں نے اپنی ایک میٹنگ کی جس میں ۴۵ نمائندے حاضر ہوئے ہڑتال چلانے کے لئے اب انہیں ایک سمجھ دار، پڑھے لکھے اور بارسوخ شخص کی ضرورت تھی۔ لہٰذا ان کی نظر ایم۔ ایس۔ خان پر گئی اور انہیں عام رائے سے ان لوگوں نے اپنی ہڑتال کمیٹی کا صدر منتخب کر لیا۔

بحری جنگی جہازوں کی ہڑتال صرف تین چار دن تک ہی چل سکی تھی۔ اس ہڑتال میں ۷۸ جنگی جہاز شامل تھے اور بمبئی کے ساحل سے لے کر وہ کلکتہ اور کراچی کے ساحلوں تک پھیل گئی تھی۔ بمبئی شہر کی ہندو مسلم پبلک نے نوسینکوں کا خوب ساتھ دیا اور ان کے لئے اپنا خون تک بہایا مگر کسی سیاسی لیڈر نے ساتھ نہیں دیا۔ ہڑتالیوں نے کانگریس، مسلم لیگ اور سی۔ پی۔ آئی تک کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ گاندھی، سردار پٹیل، جواہر لال نہرو، محمد علی جناح، ارونا آصف علی، اور مسٹر ڈانگے سب نے صرف ایک ہی رائے دی کہ ہڑتال ختم کر دو۔ لہٰذا خاں صاحب کو مجبور ہو کر اپنے لیڈروں کی بات ماننی پڑی، اور ۲۳ر فروری ۱۹۴۶ء کو ہڑتال ختم کر دی گئی۔ لیکن ہڑتال نے ختم ہونے سے پہلے اپنا تاوان وصول کر لیا تھا۔ سینکڑوں ہندو اور مسلمان شہریوں نے ہڑتالیوں کی امداد صرف کھانا دے کر ہی نہیں بلکہ خون دے بھی کی تھی۔ یہاں صرف مسلمان شہیدوں کے نام ہی دئے جا رہے ہیں۔

(یہ سب عام پبلک مظاہرے میں شریک تھے)

۲۲ر فروری ۱۹۴۶ء کے مسلمان شہید

(۱) عبدالعزیز ولد عبدالرزاق - یہ خانگی نوکر تھا۔ ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوا تھا گرانوڈ مارکیٹ کے قریب ۲۲ر فروری ۱۹۴۶ء کو پولس کی گولی کھا کر شہید ہو گیا تھا۔

(۲) عبدالعزیز ولد عبدالرحمن - ایک دکان کا نوکر تھا، اور ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوا تھا - یہ پولس کی گولی کھا کر ۲۲ر فروری کو شہید ہو گیا تھا۔

(۳) عبدال - یہ ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوا تھا، اور یہ بھی ۲۲ر فروری کو شہید ہوا تھا۔

(۴) عبدالستار ولد محمد عمر - یہ ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوا تھا اور یہ بھی ۲۲ر فروری کو شہید ہوا تھا۔

(۵) عبداللہ ولد عبدالقادر - یہ بھی پولس کی گولی سے ۲۲ر فروری کو شہید ہوا تھا۔

(۶) عبدالغنی - یہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوا تھا، اور ۲۲ر فروری کو شہید ہو گیا تھا۔

(۷) عبدالصفی - یہ ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوا تھا - فورٹ ایریا ۲۲ر فروری کو گودی پولس کی گولی کھا کر شہید ہو گیا تھا۔

(۸) آدم جی ولد محمد حسین - پیدائش ۱۹۲۴ء - پولس کی گولی کھا کر ۲۲ر فروری کو ہی اسپتال میں جا کر شہید ہوا تھا۔

(۹) علی محمد - یہ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوا تھا، اور اپنی شہادت پولس کی گولی کھا کر ۲۲ر فروری کو دادر میں دی تھی۔

(۱۰) صدیق محمد - یہ ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوا تھا، اور ۲۲ر فروری کو کماٹی پورہ میں پولس کی گولی کھا کر شہید ہوا تھا۔

(۱۱) غلام حسین ولی علی محمد کی پیدائش ۱۹۰۶ء کی ہے۔ بحری جنگی جہازوں کے باغیوں کے مظاہرے میں انہوں نے بھی حصّہ لیا تھا، اور پولیس کی گولی کھا کر ۲۲ر فروری کو شہید ہوئے تھے۔

(۱۲) ابراہیم۔ یہ ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوا تھا، اور ۲۲ر فروری کو شہید ہو گیا تھا!

(۱۳) اسمٰعیل حسین۔ یہ ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوا تھا، اور ابھی کم سن ہی تھا کہ پولیس کی کڑوی گولی کھا کر ۲۲ر فروری کو شہید ہوا تھا۔

(۱۴) مولا بخش عبدالعزیز۔ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۲۲ر فروری کو پولیس کی گولی کھا کر شہید ہو گئے تھے۔ پولیس نے پبلک مظاہرین پر بمبئی کے کئی مقامات پر گولی چلائی تھی۔

(۱۵) موسیٰ ابوبکر حسن۔ یہ ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ یہ ۲۲ر فروری کو پلٹن روڈ پر پولیس کی گولی سے شہید ہوا تھا۔

(۱۶) محمد عزیز۔ یہ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوا تھا اور پولیس کی گولی سے ۲۲ر فروری کو ہی شہید ہو گیا تھا۔

(۱۷) محمد حسین ولد ملا غلام علی عبدالحسن۔ پیدائش ۱۹۳۱ء اور پولیس کی گولی سے ۲۲ر فروری کو شہادت پائی۔

(۱۸) محمد شیخ سید حسن۔ یہ ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوا تھا۔ نل بازار کے پاس باغی ہڑتالیوں کے مظاہرے میں ۲۲ر فروری کو گولی کھا کر شہید ہوا تھا۔

(۱۹) محمد ابوبکر۔ پیدائش ۱۹۲۸ء۔ اور شہادت بھلے مارکیٹ کی گولی زنی میں ہوئی۔

(۲۰) منظور احمد۔ پیدائش ۱۹۰۶ء، شہادت ۲۲ر فروری ۱۹۴۶ء۔

(۲۱) نورالدین عبدل۔ پیدائش۔ یہ ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوا تھا اور ۲۲ر فروری کو ڈاکیارڈ کے نزدیک ہوئی پولیس کی گولی زنی سے شہید ہوا تھا۔

(۲۲) پنجلا رحیم۔ یہ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے ۲۲ر فروری کو ناخدا محلہ کے مظاہرہ میں شامل ہو کر شہادت حاصل کی۔
(۲۳) سلیمان ابراہیم۔ پیدائش ۱۹۱۴ء اور شہادت ۲۲ر فروری
(۲۴) سلیمان ذکی الدین۔ پیدائش سنہ ۱۹۰ء اور شہادت ۲۲ر فروری
(۲۵) تاج محمد فضل محمد۔ ۲۲ر فروری کی گولی زنی میں شہادت پائی۔
(۲۶) اللہ رکھا۔ پیدائش ۱۹۳۱ء اور شہادت ۲۲ر فروری ۱۹۴۶ء

۲۳ر فروری ۱۹۴۶ء کو شہادت پانیوالے

(۲۷) عبدالعلی ولد دین محمد۔ ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوا تھا، اور ۲۳ر فروری کو ناگپاڑہ پولس کی طرف سے جو گولی زنی کی گئی تھی ان منظاہرین میں یہ بھی شہید ہوا تھا۔
(۲۸) اصغر اسمٰعیل۔ یہ ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوا تھا، اور بائیکلہ کے پاس پولس کی گولی کھا کر شہید ہو گیا۔ وہ پبلک مظاہرے کو دیکھ رہا تھا۔
(۲۹) اصغر میاں نوساری۔ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ۲۳ر فروری ۱۹۴۶ء کو جے جے اسپتال کے پاس کھڑے تھے اسی وقت پولس کی گولی سے شہید ہو گئے تھے۔
(۳۰) عزیز چھوٹو۔ یہ ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ باغیوں کو مدد پہونچانے پر پولس نے گولی سے مارا۔ ۲۳ر فروری کو شہید ہو گئے۔
(۳۱) فدا علی ولد قیام علی۔ ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوا تھا۔ پولس نے بحری جنگی جہازوں کے باغیوں پر جے جے اسپتال کے قریب گولی چلائی تھی اسی وقت یہ شہید ہوا تھا۔
(۳۲) حمید ہارون۔ پیدائش ۱۹۳۱ء۔ یہ بھی پولس کی گولی کھا کر ۲۳ر فروری کو شہید ہو گیا تھا۔

(۳۳) امام علی - پیدائش سنہ ۱۹۰۶ء اور پولس کی گولی سے شہادت
۲۳ فروری سنہ ۱۹۴۶ء کو ہوئی۔

(۳۴) خدا بخش پیار - یہ بھی ۲۳ فروری کو پولس کی گولی کھاکر خدا
کو پیارے ہو گئے تھے۔

(۳۵) مولا بخش ولد عبد العزیز - پیدائش سنہ ۱۹۰۶ء - یہ پولس کی
گولی سے کماٹی پورہ میں ۲۳ فروری کو شہید ہوئے تھے۔

(۳۶) محمد سا مکھ - پیدائش سنہ ۱۹۲۰ء - یہ بھی کماٹی پورہ میں پولس
کی گولی کھاکر ۲۳ فروری کو شہید ہو گیا تھا۔

(۳۷) محی الدین ولد شیخ غلام - پیدائش سنہ ۱۹۲۶ء اس نے بھی
باغیوں کے مظاہرے میں حصّہ لیا تھا۔ پریل میں پولس کی گولی سے شہید ہوا تھا

(۳۸) عبد الرؤف - پیدائش سنہ ۱۹۱۱ء - اس نے بھی ۲۳ فروری
کو باغیوں کے مظاہرے میں حصّہ لیا تھا۔ پولس کی گولی سے شہید ہوا تھا

مجاہد جنگ آزادی مولا صاحب اور عبد العزیز منگلوری

مولا صاحب ولد ابا صاحب دیسائی بمقام انکلگی تعلقہ
گوکاک ضلع بیلگام ریاست کرناٹک میں ۲۲ فروری سنہ ۱۹۲۲ء کو
پیدا ہوئے تھے - بغرض نوکری وہ بمبئی آئے تھے، اور پریل میں رہتے تھے
جوانی کا جوش تھا اور دل میں وطن پرستی کا جذبہ۔ لہٰذا آپ نے سنہ ۱۹۴۲ء کے
"انگریزو : بھارت چھوڑ دو" تحریک میں عملی اور نمایاں حصہ لیا تھا۔

۸ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کو گوالیا ٹینک (کرانتی میدان) کے میدان میں
کانگریس کمیٹی کا ایک تاریخی عوامی جلسہ مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں
ہوا تھا۔ اسی جلسہ میں مہاتما گاندھی جی نے "کرو یا مرو" کا نعرہ بلند
کیا تھا۔ اس وقت "انگریزو بھارت چھوڑ دو" کی تجویز پاس کی گئی تھی۔

۹ اگست ۱۹۴۲ء کو طلوع آفتاب سے پہلے ہی کانگریس کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ان لیڈروں کی گرفتاری سے بمبئی شہر کی پبلک بے قابو ہو گئی تھی، اور اس نے اسی دن سے توڑ پھوڑ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جوشیلے جوان مولا صاحب بھی سر سے کفن باندھ کر میدانِ جنگ میں کود پڑے۔ مولا صاحب کے ساتھ میں قریب ۱۵۰ شخص تھے جن میں ایک عورت بھی تھی۔ ان لوگوں نے لوئر ریل سے لے کر ماٹونگا، کنگ سرکل تک کی سڑک کو پولیس کی گاڑیوں کے لئے بند کر دیا تھا۔ سڑک کے کنارے کے درخت کاٹ کر انہوں نے سڑک کو بند کر دیا تھا۔

درختوں کو کاٹ کر سڑک بند کرنے کا کام انہوں نے رات کے ۱۱ بجے سے صبح ۳ ۱/۲ بجے تک کیا تھا۔ صبح کے وقت پولس نے آکر ۱۹ افراد کو گرفتار کر لیا تھا۔ عورت کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ باقی لوگ اِدھر اُدھر بھاگ گئے تھے۔ ان لوگوں کو جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔ کئی دن تک جیل میں رہنے کے بعد مجگاؤں کورٹ میں ان کے مقدمہ کی شنوائی ہوئی۔ مجگاؤں کی عدالت نے ۱۶ ستمبر ۱۹۴۲ء کو انہیں ۶ مہینے سخت قید کا زیر دفعہ ۱۴۷/۱۴۳ کے تحت حکم سنایا۔ ایک مسلمان مجاہد عبدالعزیز بنگلوری بھی ان کے ساتھ تھے۔

۱۹ دنوں تک بمبئی کی جیل میں رکھنے کے بعد مولا صاحب کو ویساپور جیل میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس جیل میں ان کا جھگڑا جیل وارڈنوں کے ساتھ ہو گیا تھا۔ جو کھانا بہت خراب دیا کرتے تھے۔ یہ مہینہ رمضان کا تھا۔ تین دنوں تک ان کا جھگڑا چلا۔ بعد میں آئی۔ جی۔ پی کی مداخلت سے جھگڑا رفع دفع ہو گیا۔ جب مولا صاحب نے اپنی سزا پوری کر لی تو ان کو ۲ فروری ۱۹۴۳ء کو رہا کر دیا گیا۔ صرف ۲۵ دن کی چھوٹ ملی تھی۔ اس وقت آپ اپنے وطن میں رہتے ہیں، اور سماجی کام کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو کرناٹک کی حکومت سے ایک صد روپیہ ماہوار کی اور مرکزی حکومت سے ۵۰۰ روپیہ ماہوار کی پنشن مل رہی ہے

آنجہانی وزیر اعظم اندرا گاندھی کا دیا ہوا اعزازی تامبر پتر بھی ان کے
پاس ہے۔ آپ سچے مجاہد جنگِ آزادی ہیں۔

مشہور مجاہد جنگِ آزادی گجرات کے نواب ظہور الحسن

ظہور الحسن گجرات کا وہ مشہور باغی تھا جو انگریزوں کو اپنے وطن
سے نکال دینا چاہتا تھا۔ ظہور الحسن اپنے کو گجرات کا نواب کہتا تھا اور
انگریزوں کے لئے دردِ سر بنا ہوا تھا۔ لیکن اس کی گرفتاری آسان نہیں تھی۔
وہ بہت چست اور چالاک تھا۔ ظہور الحسن نے اپنا فرضی نام سرفراز خان
بتاکر نظام حیدر آباد سے گوپال تعلقہ کی تحصیل داری حاصل کرلی تھی۔ یہ
راز کسی طرح رسالدار میر مادھو بخش کو معلوم ہوگیا۔ سرکار سے انعام واکرام
پانے کے لئے اس نے اپنے کپتان تھیچر کو اس کی اطلاع کردی اور اس
کے ساتھ ہی اس نے یہ اطلاع اپنے کمانڈنگ آفیسر کو بھی کردی۔ ان
لوگوں نے فوراً ہی یہ اطلاع حیدر آباد میں مقیم ریذیڈنٹ کو بھیج دی
جب اُسے اطلاع ہوگئی تو اس نے میجر تھارن ہل کو اطلاع کردی، اور
اس نے حوالدار عبدالرحیم اور جمعدار کلیان سنگھ کے ساتھ کچھ گھوڑ
سواروں کو ظہور الحسن کو گرفتاری کے لئے بھیجا۔ ظہور الحسن کو اپنی گرفتاری
کی اطلاع پہلے ہی مل گئی تھی لہٰذا وہ فرار ہوگیا اور حیدر آباد کی سرحدوں
سے باہر ہوگیا۔ لیکن اتنے بڑے باغی کا سراغ پاکر انگریزی سرکار
اسے ہاتھ سے نکل جانے دینا نہیں چاہتی تھی۔ فرار باغی ظہور الحسن کے
پیچھے سواروں کو دوڑایا گیا۔ جنہوں نے اسے جا پکڑا۔ ظہور الحسن کی
شناخت کے لئے گجرات فوج کا رسالدار شمشیر علی بھی گیا تھا۔

ظہور الحسن کی گرفتاری کے لئے سرکار نے ۵۰۰۰ روپیہ کا
انعام رکھا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس انعام کا جائز حقدار
کون ہے۔؟ کیا جس نے ظہور الحسن کی شناخت کی وہ ہے یا جن لوگوں

نے اسے گرفتار کیا وہ ہیں؟ اس کا فیصلہ بمبئی سرکار کے سپرد کر دیا گیا تھا کہ وہ ظہور الحسن جیسے مشہور باغی کو گرفتار کرنے کے لئے جن لوگوں کو ذمہ دار سمجھے ان کے درمیان مناسب مناسب انعام کی رقم تقسیم کر دے۔ یہ فیصلہ وائسرائے صاحب کا تھا۔ ۵۰۰ روپیہ خرچ کر کے اور ملک کے چند غداروں کا ایمان خرید کر کے یوں سرکار انگلیشیہ نے سکون حاصل کیا تھا۔

احمد آباد کے مجاہد جنگِ آزادی

احمد آباد میں ۸ مسلمانوں اور چند ہندوؤں کو سازش کے معاملے میں گرفتار کیا گیا تھا کہ یہ لوگ ریاست کی فوج میں بغاوت پھیلا رہے تھے۔ ان میں چار مسلمان مجاہد تھے اور ریاست کی سرکار گائیکواڑ نے انہیں اس طرح سزائیں دی تھیں۔

(۱) عمر خان کو سات سال کی سخت قید کی سزا۔

(۲) سردار خان کو ایک سال اور

(۳) حیدر خان کو بھی ایک سال کی سزا دی گئی۔

ملک کی آزادی کے لئے انہوں نے بھی اپنی قربانی دی تھی۔

شہیدِ جنگِ آزادی صوبیدار داؤد بیگ

شہید صوبیدار بیگ ریاست کولہاپور کی فوج کا صوبیدار تھا۔ یہاں بھی مارچ ۱۸۵۷ء کے شروع میں بغاوت ہو گئی تھی۔ باغیوں کا پتہ لگانے کا کام کولہاپور کی فوج کے کمانڈر لی۔ گرانڈ جیکو کا تھا۔ اس نے جانچ کر کے ایک خط بمبئی میں مقیم فوجی جنرل کو لکھا اور اس بات کا اعتراف کیا کہ کولہاپور کی فوج میں بغاوت کیوں ہوئی ——؟ کیسے ہوئی؟ اور اس کی وجوہات کیا تھے؟ اس بات کو کوئی بتلانے کو

تیار نہیں ہے۔ چونکہ کولہاپور رجمنٹ کے دو سرداروں پر یہ شبہ کیا جاتا
ہے کہ وہ دونوں بھی بغاوت میں شامل تھے یا ان کو بغاوت کا علم تھا مگر
ان دونوں میں سے کوئی کچھ بتانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ لہٰذا ان دونوں
کو موت کی سزا دی گئی ہے۔ ان میں ایک ہندو ایک مسلمان تھا۔ دونوں
کو ۱۱ مارچ ۱۸۵۸ء کو توپ سے اڑا دیا گیا۔ یہ خط کولہاپور کے کمانڈنگ
آفیسر نے ۱۲ مارچ ۱۸۵۸ء کو بمبئی کے فوجی کمانڈر انچیف کو لکھا تھا۔

صوبیدار داؤد بیگ نے اپنے وطن کے لئے مرجانا تو قبول کیا مگر
اپنے کسی وطنی بھائی کی گردن میں پھانسی کی رسی ڈالوانا پسند نہیں
کیا۔ اپنی قربانی دے کر صوبیدار داؤد بیگ نے ثابت کر دیا تھا کہ نہ وہ
وطن فروش ہے اور نہ ہی ضمیر فروش۔ وطن پرستی اور ایمان پر قائم
رہنے کی نظیر بڑی مشکل سے آج کے دور میں دیکھنے کو ملے گی۔

جنگِ آزادی کے شہید سیّد غلام حسین

پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد ظالم انگریزوں نے
مجاہدوں کو جس بے دردی اور بے رحمی سے قتل کیا تھا اس کا تصوّر
کر کے رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں ...... یہ وہ داستان ہے جو ہمیں
ہماری غلامی اور ہماری بے بسی کی شدّت سے یاد دلاتی ہے۔ غلامی
کتنی بڑی بلا ہے ...... اس کا وہی احساس کر سکتا ہے جس نے غلامی
کی فضا میں سانس لی ہو۔ غلامی کے مقابلے میں موت کو ترجیح دینا
وہ زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔ جس طرح موت ایک بلبلے کی مانند ہے اسی
طرح غلامی کی گھٹی گھٹی فضا میں زندگی کی سانسیں بھیک کی معلوم ہوتی ہیں
مجاہدینِ آزادی جو ایک منظم تحریک پر عمل کرتے تھے۔ ان کا مقصد صرف
یہ تھا کہ موت تو آنی ہی ہے تو کیوں نہ غلامی کی زنجیریں پوری طاقت
کے ساتھ نکال پھینکیں۔ جب مرنا ہی ٹھہرا تو وطن کے لئے کیوں
نہ جان دے دیں۔ کتنی اذیت پہنچتی ہے یہ سوچ کر کہ ہمیں ہماری

ہی کا سرزمین پر روندا گیا۔ بے عزت کیا گیا۔ الزامات لگائے گئے۔ توپ
سے باندھا گیا۔ پیڑوں سے لٹکایا گیا۔ قتل کیا گیا۔ پھانسیاں دی
گئیں ..... ہمارے ہزاروں ہندو اور مسلمان شہیدوں نے متحد ہو کر،
ایک مقصد لے کر، ایک نعرہ کے ساتھ، پوری طاقت لگا کر اپنا خون
بہایا تھا۔ یہ خون جو سب کی رگوں میں ایک جیسا ہے ؎

یہ کس کا لہو ہے کون مرا

اس خون کو دیکھ کر کوئی بتا سکتا کہ یہ ہندو کا ہے یا مسلمان
کا۔ کیونکہ خون بس خون تھا۔ اس خون کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا...
اس ضمن میں اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہ خون ہندوستانیوں کا تھا۔
جنہوں نے آزادی حاصل کرنے کے لئے بہایا تھا۔ لیکن کتنی عجیب بات
ہے خون تو آج بھی بہتا ہے مگر وہ آزادی کے لئے نہیں، بربادی
کے لئے بہتا ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے۔ ہندوستان کے
تحفظ، اس کی ترقی کے لئے کتنے ہندوستانی ایسے ہیں جو شہیدوں
کی طرح اپنا فرض بے لوث طریقے سے نبھا رہے ہیں۔؟ اس مرحلے پر
صرف سوچنے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ سنجیدگی کی بھی ضرورت ہے۔

سید غلام حسین بحری فوج ۱۰ ویں کا ایک وطن پرست حوالدار
تھا۔ بحری فوج ہو یا بری فوج ہو سب میں ۱۸۵۷ء کے غدر کا اثر
تھا اور ان فوجیوں میں جن کو بھی اپنی غلامی کا احساس تھا وہ غلامی کی
زنجیریں توڑ کر نکل کر بھاگنا چاہتا تھا۔ بمبئی کے ہندو اور مسلمان فوجیوں میں
بھی ۳۰ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو عید کے مبارک موقع پر غدر کے لئے قبضہ
صلاح و مشورہ ہو رہے تھے۔ قوم کے کچھ غداروں نے ترقی انعام و اکرام
پانے کے لالچ سے اپنے انگریز آقاؤں کو خبریں پہنچا رہے تھے۔

تھوڑا بھی پتہ لگ جانے یا شک ہوجانے پر کہ فلاں سپاہی،
حوالدار یا رسالدار وغیرہ انگریزوں کے خلاف سازش میں مبتلا ہیں تو پھر
اس کی خیر نہیں تھی۔ کسی مخبر نے بریگیڈیر جے۔ ایم۔ شارٹ کو خبر کردی کہ

بحری رجمنٹ نمبر ۱۰ کا حوالدار سیّد غلام حسین سازش میں مشغول ہے اور اس کا ایک ساتھی منگل بھی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ ان دونوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۳ر جنوری ۱۸۵۸ء کو ان دونوں کو زنجیروں سے باندھ کر اس جگہ لایا گیا جہاں انصاف کا خون کیا جاتا ہے۔ ۱۵ر جنوری ۱۸۵۸ء کو انہیں ملزم قرار دیا گیا اور توپ دَم کرنے کا حکم نافذ کیا گیا۔

سر، ڈی۔ ای۔ واچہ نے توپ دَم کئے جانے کا خوفناک منظر یوں بیان کیا ہے.....

حوالدار سیّد غلام حسین کو ایک اور ملزم کے ساتھ الگ الگ دو توپوں کے دہانے سے زنجیروں سے باندھ دیا گیا تھا۔ ان کے توپ دَم کئے جانے کے نظارے کو دکھانے کے لئے خصوصی طور پر بحری اور برّی رجمنٹوں کو بلا لیا گیا تھا۔ ایک بڑی کثیر تعداد میں تماشائی بھی اس دل ہلا دینے والے مقام پر جمع ہو گئے تھے۔ بہت سوں کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ مجمع کیوں لگا ہوا ہے۔ سب ایک دوسرے سے دریافت کر رہے تھے۔

کچھ دیر کے بعد سر، ڈی۔ ای۔ واچہ نے بمبئی کی چوپاٹی کے قریب الفنسٹن کالج کے چوراہے پر دو توپوں کے منہ پر بندھے دو اشخاص کو دیکھا۔ تب معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک سیّد غلام حسین حوالدار ہے اور

انگریزوں کے خلاف سازش کرنے کے جرم میں ان کو توپ دم کیا جائیگا۔ بہت لوگوں کو دکھ بھی ہو رہا تھا اور جن کو اس نظارہ کی تاب نہ تھی وہ وہاں سے دُور چلے گئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے توپ کے داغنے کی زوردار آواز سنی اور اس کے بعد ان وطن پرستوں کی لاشوں کے ٹکڑے آسمان میں اُڑتے دیکھے چاروں طرف کالا اور بدبودار دھواں پھیل رہا تھا۔

ایسے جیالے، شیر دل مجاہد سید غلام حسین کو عقیدت بھرا سلام۔

غلام حسین مر کر دے گیا ہم کو یہ پیغام
ہم وطنو تمہیں لینا ہے میرے خون کا انتقام

بلڈانہ (مہاراشٹر) کے غلام احمد خاں ولد غلام چاند

غلام احمد خاں بمقام پیپل گاؤں راجہ تعلقہ کھام گاؤں ضلع بلڈانہ میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ انہوں نے لوک مانیہ تلک کے ۱۹۱۳ء سورت میں بلائے گئے کانگریس کے جلسے میں حصہ لیا تھا۔ ان کے ساتھ اُمراؤتی کے دیر دامن راؤ بھی تھے۔ تلک کی طرح تعلیم پر یہ بھی بہت زور دیتے تھے اور مسلمانوں کی تعلیم کے لحاظ سے پسماندہ ہونے کی وجہ سے ان کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ لہٰذا موصوف نے ان کی تعلیم کے لئے بڑی جد وجہد کرکے کامیابی حاصل کی۔

تعلیم کے علاوہ غلام احمد خاں کو کھیتی کے بھی غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس کا ذکر تو انگریزی سرکار تک نے کیا ہے۔ یہ کانگریس کے پکے سپاہی تھے اور کانگریس کے ہر حکم پر عمل کرنے والے تھے۔ چنانچہ جب ۱۹۲۰ء کے عدم تشدد کی تحریک شروع ہوئی اور اسکولوں کالجوں کا بائیکاٹ کرنا شروع کیا گیا تو انہوں نے اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے ان تمام لڑکوں کو جو علیگڈھ کی مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پاتے تھے انہیں وہاں سے

نکال کر مکتبہ جامعہ ملیہ میں داخل کرادیا کیونکہ وہ ادارہ وطن پرستی کی تعلیم دیتا تھا۔

مرحوم لوک مانیہ تلک کے خاص پیرو کاروں میں سے تھے اور تاحیات ان کے اخبار کیسری کے خریدار بنے رہے۔ جنگ آزادی میں ان سے جو ہو سکا مدد پہونچاتے رہے۔ اپنے علاقے میں ان کا اثر تھا اور لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ آپ کا انتقال ۱۹۳۹ء میں ہوا تھا۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ ایک محبِ وطن نہ رہا۔

غلام مصطفےٰ خاں ولد غلام احمد خاں

ان کی پیدائش بھی بمقام پیپل گاؤں راجہ میں ۱۸۹۲ء میں ہوئی تھی۔ یہ بھی اپنے والد ماجد کے نقشِ قدم پر چلے تھے اور تمام عمر کانگریس سے وابستہ رہے تھے۔ ان کو پہلے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم کے لئے بھیجا گیا تھا۔ مگر وہاں سے انہیں ۱۹۱۶ء میں نکال کر مکتبہ جامعہ کے قومی ادارے میں داخل کرایا گیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں آل انڈیا کانگریس کا اجلاس ناگپور میں ہوا تھا۔ آپ نے بھی اس میں شرکت فرمائی تھی۔ آپ نے (Batata System) کو ختم کرنے کی جدوجہد میں خوب حصہ لیا، اور کامیابی حاصل کی۔ انگریز سرکار آپ کے خلاف ہوگئی آپ پر ۱۹۲۰ء میں مقدمہ چلایا گیا اور آپ کو ایک ماہ کی سادی قید اور ۱۵۰۰ روپیہ جرمانہ ادا کرنے کی سزا دی گئی۔

نیتاجی سبھاش چندر بوس جب ۱۹۳۹ء میں کھام گاؤں تشریف لائے تو غلام مصطفےٰ خاں نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا تھا کانگریس کی ہر تجویز کو آپ عملی جامہ پہنانے کا کام کرتے تھے اور اسی لئے یہ اس علاقے کے مشہور نیتا بن گئے تھے۔

مہاراشٹر سرکار کی طرف سے آپ کو ۱۹۶۶ء میں اعزازی

سند پیش کی گئی اور ۲۵ روپیہ کا نذرانہ بھی عطا کیا گیا۔ آپ کا انتقال ۱۹۷۱ء میں ہو گیا۔ آپ خاندانی وطن پرست تھے۔

غلام ربانی خان ولد غلام مصطفےٰ خان

ان کی پیدائش ۱۹۱۶ء میں بمقام پیپل گاؤں راجہ، تعلقہ کھام گاؤں میں ہوئی تھی۔ یہ ۱۹۳۹ء میں برٹش آرمی میں بھرتی ہوئے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں انہیں سمندر پار بھیجا گیا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں برٹش آرمی نے جاپانیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے، اور جاپانیوں نے بہت سے فوجیوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ بعد کو کیپٹن موہن سنگھ اور اور کیپٹن اکرم کی کوششوں سے انہیں جاپان کی قید سے رہائی دلائی گئی اور آزاد ہند فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ آزاد ہند فوج میں شامل ہو کر آپ اور آپ کے دیگر ساتھی بہت خوش ہوئے کیونکہ اب انہیں مادرِ وطن کی خدمت کا موقعہ مل گیا تھا۔ نیتاجی جب جرمن سے جاپان آئے تو سب سے پہلے پٹھان رجمنٹ نے ان کا شاندار استقبال کیا تھا، اور اس میں غلام ربانی پیش پیش تھے۔

کبھی برٹش آرمی نے جاپانی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے تو اب ۱۹۴۵ء میں جاپانی فوج کے ساتھ آزاد ہند فوج نے برٹش فوج کے سامنے اپنے ہتھیار ڈالے تھے اور برٹش کے قیدی بن گئے تھے۔ اب ربانی صاحب اور دیگر فوجیوں پر بیرک پور کیمپ کی فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ کسی کے کہنے سننے سے متاثر نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کا اصل مقصد تو مادرِ وطن کی خدمت کرنا تھا۔ بعد میں برٹش حکومت رائے عامہ سے مجبور ہو کر سب کو رہا کر دیا تھا

۱۵ اگست ۱۹۷۲ء کو ہندوستان کی آزادی کا جشن جوبلی دہلی میں منایا گیا۔ اس وقت آپ کو سمان تامر پتر عطا کیا گیا۔ مجاہدین کے لئے یہ

بہت بڑی وطن پرستی کی سند ہے۔ ہر مسلمان کے لئے یہ فخر کی بات ہے کہ مسلمان پٹھانوں کا یہ ایک ایسا خاندان گزرا ہے۔ جس کی تین نسلوں نے ہندوستان کی آزادی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ خدا کے فضل سے غلام ربانی صاحب ابھی بہ حیات ہیں اور رفاہِ عام کے کاموں میں برابر دلچسپی لیتے رہتے ہیں۔

غلام یٰسین خاں ولد عمر خاں

یہ ایک بے مثال مجاہد تھے۔ انہوں نے ہندوستانی قومی جماعت آل انڈیا کانگریس کے قیام ۱۸۸۵ء کے زمانے میں انگریزوں سے بائیکاٹ کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ مرحوم نے قریب ایک لاکھ روپیہ کا چندہ جمع کر کے کانگریس کی مالی امداد کی تھی۔ ان کا انتقال ۱۹۳۵ء میں ہو گیا تھا۔

قدرت اللہ خاں ولد واجد علی خاں

یہ پکے کانگریسی تھے اور انہوں نے ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ جب تحریک عدم اعتماد شروع ہوئی تو آپ اس میں کود پڑے۔ آپ کو چھ ماہ تک جیلوں میں نظربند رکھا گیا۔ اس مجاہد جنگِ آزادی کا انتقال ۱۹۵۶ء میں ہو گیا۔

ظریف خاں

ظریف خاں بھی آزاد ہند فوج کے ایک بہادر سپاہی تھے۔ یہ میل گاؤں راجہ کے باشندے تھے۔ اسی گاؤں میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے انتقال کی ٹھیک تاریخ معلوم نہیں ہو سکی۔

مُجاہد شیخ امام صاحب

خاندؔ وہ کے شیخ امام صاحب اور بدنیرہ بھوجی کے محمد حنیف صاحب یہ دونوں ہی آزاد ہند فوج کے سپاہی تھے اور مادرِ وطن کی آزادی کے لئے انگریزوں سے لڑے تھے۔ مرحوم کی بیوہ کو مہاراشٹر کی حکومت نے ماہانہ پنشن مقرر کر دی ہے۔

مجاہد جنگ آزادی محمود خاں ولد یوسف خاں، ان کی پیدائش گاؤں بدنیرہ بھوجی تعلقہ ناندورہ ضلع بلڈانہ میں ہوئی تھی یہ بھی آزاد ہند فوج کے ایک بہادر سپاہی تھے۔ ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے حکومت ہند نے ان کو ۱۹۷۲ء میں تام رپتر (ڈگری اعزازی سند) عطا کی تھی اور ان کو ماہانہ پنشن بھی دی گئی۔ اس طرح سے اگر دیکھا جائے تو وطن کی آزادی کی لڑائی میں بلڈانہ کے مسلمانوں نے کافی حصّہ لیا تھا اور اپنا ایک مخصوص مقام حاصل کر لیا ہے۔

کانپور کے دو اور مُجاہد جنگِ آزادی

(۱) غازی بابا بھارتی (مولانا شہزادہ محمود صاحب نگرانی) کانپور کی ایک عجیب شخصیت تھے۔ جنہوں نے کبھی سرکاری نوکری نہیں کی، اور عمر بھر آزاد رہ کر ملک کی خدمت کرتے رہے اور کئی مرتبہ جیل گئے۔ وہ بڑے لمبے قد کے اور بھرے بھرے جسم کے آدمی تھے ہمیشہ کھادی کی پوشاک پہنتے تھے اور ان کی کلائی پر ایک بڑی سی گھڑی بندھی رہتی تھی۔ بڑے خوش دل انسان تھے۔ کانپور کے تلک ہال میں ان کا اکثر آنا ہوتا تھا۔ وہیں راقم نے ان کو دیکھا تھا۔ ان کی بیٹھک جناب بشیر احمد پینٹر ۲۰/۲ رام نرائن بازار میں ہوتی تھی جن سے مجھے غازی بابا کے کچھ حالات معلوم ہوئے ہیں۔ غازی بابا چونکہ

وطن پرست اور خوش اخلاق تھے۔ ان کی تعلیم (اتر پردیش کے مشہور
مدرسہ دیوبند میں ہوئی تھی۔ دیوبند کے ادارے میں طالب علموں
کو مذہبی تعلیم کے علاوہ وطنی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس لئے اس ادارے
کے طلبا زیادہ تر وطن پرست ہوتے تھے۔ وہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب
کے شاگرد تھے۔ جنگ آزادی کی لڑائی میں وہ اسی وقت شامل ہو گئے تھے
جبکہ وہ دیوبند میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ سب سے پہلے ۱۸۹۸ء
میں اعظم گڈھ کے ایک عام جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے پرزور
الفاظ میں کہا تھا کہ ہمیں بھی آزاد رہنے کا حق حاصل ہے۔ ہم انگریزوں کی
غلامی کرنے کے لئے تو پیدا نہیں ہوئے ہیں) سرکار نے انہیں گرفتار کر لیا تھا
اور چھ مہینے کے لئے انہیں جیل کی سزا دی گئی تھی۔ اس کے بعد تو جیل
جانے کا ان کا سلسلہ ہی شروع ہو گیا تھا۔ حسرت موہانی کی طرح وہ بھی
جوشیلے انسان تھے۔ ان کے ساتھ انہیں بھی ایک بار کراچی جیل میں
رکھا گیا تھا۔ یہاں ان دونوں پر بڑی سختیاں ہوئی تھیں۔ ان دونوں کو
ان کے پیر باندھ کر کنوئیں تک میں لٹکایا گیا تھا۔ مگر انہوں نے اس کی پرواہ
نہ کی، کیونکہ انہیں انگریزوں کی غلامی پسند نہ تھی۔

مولانا حسرت موہانی اپنی بذلہ سنجی سے کنوئیں میں لٹکے ہوئے خفر صاحب
سے کہتے۔ "اماں خفر، کوئی غزل ہو تو سناؤ"
حالانکہ اکثر یہ حالت ہوتی تھی کہ آنتیں منہ میں آنے لگتی تھیں اور
اسی حالت میں وہ بے ہوش تک ہو جاتے تھے۔ وہ کتنی بار جیل گئے،
اس کا کوئی ریکارڈ نہیں، لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ عدالتوں نے ان کو
۴۳ سال کی سزائیں دی تھیں۔ لکھنؤ کے قصبہ نگرام میں خفر صاحب
کی کچھ جائیداد بھی تھی۔ جو ان کے لئے ذریعۂ معاش کا کام دیتی تھی
۷۵ سال کی عمر میں ۷ دسمبر ۱۹۶۳ء کو کانپور کے محلہ پٹکاپور میں انہوں
نے رحلت فرمائی۔ گویا ملک کو آزاد کرا کر ہی وہ رخصت ہوئے تھے
آپ کی اولاد میں سے تین لڑکے بقید حیات ہیں۔ حکیم سلطان بھارتی

طارق بھارتی اور راشد بھارتی۔ کلیم خالد، باندہ (اترپردیش) میں مطب کرتے ہیں۔

مجاہد جنگِ آزادی جناب نسیم خانؒ

مجاہد جنگ آزادی جناب نسیم خان۔ بانس منڈی کان پور (اترپردیش) کے رہنے والے تھے۔ کانپور میں ہی وہ اپنا کاروبار کرتے تھے۔ ان کے والد جناب شیر زمان خان ولد محمد دلیل خان موضع گلزار پور تحصیل صفی پور ضلع اناؤ (اترپردیش) کے رہنے والے تھے۔ جناب نسیم خان آزادی کے سرگرم کارکن تھے اور آپ کا تعلق کانپور کے آزادی کے لیڈران جیسے جناب گنیش شنکر ودیارتھی، جناب پیارے لال اگروال، جناب نرائن پرشاد ارورا، جناب حمید خان، اور مولانا حسرت موہانی سے تھا۔ آپ نے کانگریس کے علاوہ خلافت میں بھی کام کیا ہے۔ بلکہ کانپور خلافت تحریک کے جناب نسیم خان ایک ممتاز کارکن تھے۔ اس تحریک کو انہوں نے مالی امداد بھی پہنچائی تھی۔ آپ نے مولانا محمد علی جوہر کی یاد کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک کتاب بھی شائع کرائی تھی اور کانپور کے تلک ہال کے تعمیری کام میں مالی امداد بھی پہنچائی تھی۔ ۱۹۳۱ء کے فساد میں جب کچھ غنڈوں نے کانپور کے مشہور لیڈر جناب گنیش شنکر ودیارتھی کو قتل کر دیا اور کانپور میں بدامنی پھیل گئی تو امن و امان کی بحالی کے لئے نسیم صاحب نے بہت کام کیا۔ ۱۹۲۵ء میں جب کانپور میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا سالانہ جلسہ ہوا تو اس میں بھی نسیم خان نے بڑی ذمہ داری سے کام کیا۔ وہ کئی اداروں کے ممبر تھے اور ۱۹۲۸ء میں رحلت فرما گئے۔

مجاہد جنگ آزادی مولانا سنت سنگھ

مولانا سنت سنگھ یوسف کانپور کے بہت مشہور مزدور لیڈر تھے۔ راقم نے جن کو بارہا دیکھا تھا اور ان کی انقلابی تقریریں بھی سنی تھیں۔ آپ ۱۹۰۸ء میں لاہور میں پیدا ہوئے تھے اور آپ کی والدہ کا نام لچھمی دیوی تھا۔ اصل میں آپ کا نام سنت سنگھ ہے مگر اسلام مذہب اختیار کر لینے کے بعد آپ کو مولانا یوسف کہنے لگے تھے۔ بڑے تیز اور جوشیلے آدمی تھے۔ کانپور میں چونکہ مزدور زیادہ رہتے ہیں۔ جہاں بہت سے روئی اور چمڑا وغیرہ کے کارخانے ہیں۔ اس لئے آپ نے کانپور کو ہی اپنا مرکز بنایا تھا۔ حب وطن کا جذبہ مولانا یوسف میں بدرجہ اتم تھا۔ مزدوروں کے درمیان خود مزدور بن کر رہتے تھے۔ کانگریس کی عدم تشدد کی لڑائی میں بھی آپ نے حصہ لیا تھا اور جیل گئے تھے۔ مولانا یوسف کا تو پیشہ ہی بغاوت تھا۔ شروع میں آپ نے بجلی گھر میں نوکری بھی کی تھی۔ اس لئے مزدوروں کی مشکلات سے وہ واقف تھے۔ دن میں مزدوری کرتے اور رات کو پڑھتے تھے اور پھر ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی۔ پہلے آپ لاہور سے دہلی آکر ایک کارخانے میں نوکر ہوئے تھے اور بعد میں کانپور آگئے تھے اور آپ کا جیل کا سفر دہلی سے ۱۹۳۰ء میں شروع ہو گیا تھا پھر تو آپ نے درجنوں جیلوں کو آباد کیا جیسے مانٹگمری جیل، ملتان جیل، لاہور جیل، سابرمتی جیل، کانپور جیل، فتح گڑھ جیل، لکھنو جیل، نینی جیل، اناؤ جیل، سیتاپور جیل، آگرہ جیل، دیولی کیمپ جیل، بریلی سنٹرل اور ایٹہ جیل، شاید ہی کوئی دوسرا مجاہد جنگ آزادی نے اپنی زندگی میں اتنی جیلوں کا پانی پیا ہو۔

مولانا یوسف تو مجسم انقلاب تھے۔ ان کی زندگی کے قیمتی دس

سال لاہور اور اتر پردیش کی جیلوں میں ہی گزرے تھے۔ وہ جم کر کام کرنے والے شخص تھے۔ دہلی، بمبئی، احمد آباد اور کانپور جہاں بھی مل یا کارخانے تھے وہاں مولانا یوسف نے مزدوروں کے لیے کام کیا اور ان کی تنظیم کو مضبوط کیا۔ ویسے مولانا یوسف نے ہر سیاسی جماعت میں کام کیا جیسے کانگریس، سیوادل، بھارت نوجوان سبھا کمیونسٹ پارٹی اور کانپور مزدور سبھا، کمیونسٹ پارٹی کے تو آپ آل انڈیا لیڈر رہے تھے۔

یوسف مزدوروں کے تو مسیحا ہی تھے۔ سرمایہ داروں نے کئی بار آپ پر قاتلانہ حملے تک کرائے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں ہڑتالوں کی رہنمائی کی تھی۔ کانپور سے آپ یوپی اسمبلی کے لیے چنے گئے تھے۔ ۱۹۸۲ء میں کانپور میں ہی اس شہید انقلابی مزدور لیڈر کا انتقال ہوگیا تھا۔ کانپور کا بچہ بچہ مولانا یوسف کو ایک جوشیلے انقلابی لیڈر کی شکل میں پہچانتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مولانا یوسف کو خدا نے مزدوروں کے درمیان کام کرنے کے لیے ہی پیدا کیا تھا۔

چھوٹانی خاندان کی قربانیاں

بمبئی کا ہر باشندہ چھوٹانی خاندان سے ضرور واقف ہوگا کیونکہ اس خاندان کی بڑی بڑی ممتاز ہستیاں جنہوں نے اپنے پیارے وطن کی بھلائی کے لیے "اور اس کی آزادی کے لیے" اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔ بالفاظ دیگر انہوں تن، من، دھن سے ملک کی خدمت کی تھی۔

محمد حاجی صابو صدیق صاحب نے اپنی ۲۳ سالہ قلیل عمر میں ہی رفاہِ عام کے وہ کام کر دکھائے ہیں جو کوئی لمبی عمر پاکر بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ان کے والد جناب حاجی صابو صدیق شکر کے ایک بہت بڑے تاجر تھے۔ جو ماریشس سے شکر کے جہاز منگواتے تھے، اور خاندانی جائیداد بھی بے شمار تھی۔ اس کے باوجود ان کے لائق صاحبزادے

نے ان کی دولت اپنے عیش و آرام پر خرچ کرنے کی بجائے فلاحی کاموں پر خرچ کی، اور ۴۳ لاکھ روپیے خرچ کر کے بمبئی میں مسلم جماعت کے لئے وہ ادارے قائم کر گئے جو رہتی دنیا تک ثواب جاریہ ان کے خاندان کے لئے بنے رہیں گے۔ کچھ اداروں کے نام ہیں:-

(۱) محمد حاجی صابو صدیق مسافر خانہ

(۲) محمد حاجی صابو صدیق ٹیکنیکل انسٹیوٹ

(۳) محمد حاجی صابو صدیق زچہ خانہ

(۴) انجمن اسلام ہائی اسکول کو ایک لاکھ کا عطیہ اور دیگر اداروں کو تعاون اور مالی امداد۔

محمد حاجی صابو صدیق نے اپنی قوم کی ترقی، اور بھلائی کیلئے اپنی دولت کا صحیح استعمال کیا۔

چھوٹانی خاندان کا تعلق مسلمانوں کی میمن جماعت سے ہے، جن کا پیشہ تجارت ہے۔ تجارت کرنے والے سبھی میمن جماعت کے مسلمان مالدار ہیں۔ ایسی میمن جماعت کے حاجی میاں محمد چھوٹانی، اور اُن کے بھائی میاں احمد چھوٹانی نے جنگِ آزادی اور خلافت تحریک میں اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔

چھوٹانی برادران نے علی برادران محمد علی اور شوکت علی کے حوالے اپنی ۱۱۱۱ سو گز لکڑی کے بھمار اور بہت سی عمارتیں کر دی تھیں۔ انگریزی حکومت نے چھوٹانی برادران کی آزادی کی تحریک سے الگ رکھنے کی ہر چند کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بعد تو حکومت نے ان جوشیلے اور وطن پرست بھائیوں کو برباد کر کے ہی چھوڑا۔ کروڑوں کی حیثیت رکھنے والے کوڑیوں کے محتاج ہو گئے۔ سرکار نے ان کے سبھی ٹھیکوں کو منسوخ کر دیا۔ علاوہ ازیں ان کی تجارت پر بھی پابندیاں لگا دی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ خاندان کنگال ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی ان بھائیوں کے چہرے

پرشکن نہ آئی۔ ؎

یہ مرتبہ بلند جسے مل گیا ملا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

میمن خاندانی جماعت سے تعلق رکھنے والے چھٹانی خاندان نے وہ عزت اور شہرت حاصل کی وہ دوسرے خاندانوں کو نصیب بھی نہیں ہوئی۔

علیگڈھ اور ہماری جنگِ آزادی

ہماری جنگِ آزادی کو انگریزی حکام نے سپاہی بغاوت یا غدر کا نام دیا ہے جو کہ دراصل ہماری پہلی جنگِ آزادی تھی۔ اس جنگ کا سب سے زیادہ زور اتر پردیش میں رہا ہے۔ کیونکہ یہ جنگ وہیں سے شروع کی گئی تھی۔ اس جنگ میں علیگڈھ نے بھی نمایاں حصہ لیا تھا اور ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے پیارے وطن کے لئے مل کر خون بہایا تھا۔

غوث محمد خان

یہ سکندر آباد کے بڑے زمیندار تھے۔ دہلی بادشاہ کے صوبیدار علی داد خان نے غوث محمد کو علیگڈھ کا نائب صوبیدار مقرر کیا تھا۔ غوث نے محمود خاں کو تحصیلدار مقرر کیا اور حسن خاں میواتی کو شہر کوتوال بنایا تھا۔ غوث صاحب کا ارادہ ہاتھرس پر حملہ کرنے کا تھا تاکہ وہاں سے غیر ملکیوں کو بھگا دیا جائے۔ ان کے پاس قریب پانچ یا چھ ہزار فوج تھی اور کچھ توپیں تھیں مگر انگریزی فوج نے ان کو مان سنگھ کے باغیچے (علیگڈھ) کے پاس روک لیا اور وہاں خون ریز لڑائی ہوئی۔ بہت سے لوگ شہید ہوئے مگر انگریز علیگڈھ پر قبضہ نہ کر سکے۔ پر انگریز خاموش بیٹھنے والے کب تھے۔ ستمبر ۱۸۵۷ء میں انہوں نے دوبارہ حملہ کر دیا اور علیگڈھ پر قبضہ کر لیا۔ اس میں غوث محمد شہید ہو گئے۔

نسیم اللہ خاں پر فتح پور کے جج کو قتل کرنے کا الزام لگایا گیا اور انہیں پھانسی پر چڑھا یا گیا۔ حسین خاں میواتی (علیگڈھ کے شہر کوتوال) کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور ۱۷؍ جولائی ۱۸۵۸ء کو پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی کی سزا پانے والے دیگر بہت سے لوگ تھے۔ علیگڈھ میں چپاتیاں اور کمل کے پھول پہلے سے تقسیم کئے جا رہے تھے۔ یہ علامت غدر کی نشانی تھی۔ لوگ چوکنے ہو رہے تھے۔ میرٹھ میں جب ۱۰؍ مئی ۱۸۵۷ء کو بغاوت شروع ہو گئی تو اس خبر نے علیگڈھ کے لوگوں کو خبردار کر دیا تھا۔ ۱۲ مئی کو علیگڈھ میں بھی بغاوت شروع ہو گئی تھی۔ ۱۷؍ مئی ۱۸۵۷ء کو ایک انگریز کا بنگلہ جلا دیا گیا۔ سرکاری خزانہ لوٹ لیا گیا اور سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دی گئی۔ سرکار کے ظلم و ستم کو دیکھ کر اس کی نوویں پلٹن باغی ہو گئی تھی۔ جس میں ہندوستانی تھے۔ ۵؍ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو کرنل گریتھیڈ کی فوج علیگڈھ میں گھس آئی اور پھر ۶؍ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو علیگڈھ کے انقلابیوں نے اکبر آباد میں اس کا مقابلہ کیا۔ مگر اپنے پرانے ہتھیاروں کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے۔ یہاں ۲۵۰ انقلابی شہید ہوئے جن میں کتنے ہندو تھے اور کتنے مسلمان تھے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا۔ وہ تو سب اپنے وطن کی آزادی کے لئے شہید ہو گئے تھے۔ صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ

ے ہندو قتل ہو یا کہ ہو مسلماں
دونوں کے خون کا اک ہی نشاں

جب انگریزوں کو پتہ چلا کہ علیگڈھ کے مشہور انقلابی لیڈر جناب رحیم علی اپنی فوج کے ہمراہ مقابلے کے لئے آرہے ہیں، تو انگریزوں نے انہیں مان سنگھ کے باغیچے کے پاس گھیر لیا تھا، اور پھر خوفناک لڑائی ہوئی تھی۔ حالانکہ رحیم علی کے پاس ۱۰۰۰ فوج اور ۳ توپیں تھیں مگر انگریزوں کے مقابلے کے لئے یہ طاقت بالکل ناکافی تھی۔ رحیم علی شہید ہو گئے۔

مولوی عبدالجلیل خاں، یہ چھتاری کے رہنے والے تھے۔ وطن پرست تھے اور انگریزوں سے دلی نفرت کرتے تھے۔ ان کے پاس جو

طاقت تھی اس کو لے کر انہوں نے بھی ۲۴ اگست ۱۸۵۷ء کو مان سنگھ کے باغیچے کے قریب انگریزی فوج کا مقابلہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ انگریزوں کے پاس پنجابی جوانوں کی ایک بڑی فوج تھی جو لڑائی کے حربوں سے واقف تھی اور ان کے پاس اچھے قسم کے ہتھیار بھی تھے۔ مولوی عبدالجلیل خاں نے بھی اس لڑائی میں شہادت کا جام پیا تھا۔ علیگڈھ کی جامع مسجد کے پاس ان کی مزار آج بھی ہے۔

علیگڈھ شہر اور ضلع کے کتنے چوراہے اور درخت ایسے ہیں جو انگریزی حکومت کی ظالمانہ حرکتوں کی اور ہندوستانی عوام کی غلامی کی داستان کہتے ہیں۔ ان خاک نشینوں کو ہمارا سلام

شعلۂ انقلاب، بچا جان محمد

بچا جان محمد کا حسب و نسب صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ ایک انقلابی نوجوان تھے اور اپنی تقریر میں شعلہ فشانی کرتے تھے پہلے وہ احمد آباد میں مزدوروں کے درمیان کام کرتے تھے۔ بعد ازاں وہ کانپور آکر مزدوروں کے بیچ کام کرنے لگے تھے۔ یہ زمانہ دوسری عالمی جنگ کا تھا۔ صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں تھیں مگر وہ بھی انگریزوں کی ماتحت تھیں۔ ایسی حالت میں انگریزی حکومت اور جنگ کے خلاف کچھ کہنا بغاوت تھی۔ آپ نے ایک جلسہ میں کانپور کے مزدوروں کو بغاوت کے لئے آمادہ کیا تو آپ کو گرفتار کر لیا گیا اور آپ پر بغاوت کا مقدمہ چلا اور آپ کو عمر قید کی سزا دی گئی جو بہت سخت سزا تھی۔

بچا جان محمد کا کہنا تھا کہ ہندوستانیوں کو جیلوں میں جو کھانا دیا جاتا ہے وہ انگریزوں کے کتے بھی نہیں کھا سکتے ہیں، اور ہمارے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ حقارت آمیز ہوتا ہے ایسی حالت میں اگر بغاوت نہ کی جائے تو کیا دوستی کی بات کی جائے۔

ایک لمبے عرصے تک جیل کی سخت [illegible]

پھر چچا جان محمد جیل سے باہر آئے تب بھی وہ انگریزوں کے دشمن ہی تھے ان کا خاندان برباد ہو گیا مگر انگریزوں سے دشمنی نہیں چھوڑی جبکہ اس وقت انہیں اپنے لئے روٹی فراہم کرنا مشکل تھا۔

جان محمد سچے مجاہد جنگِ آزادی تھے۔

مجاہد جنگِ آزادی

خواجہ عبدالمجید

خواجہ عبدالمجید کا تعلق علی گڑھ کے پرانے زمینداروں کے بڑے گھرانے سے تھا۔ ان کے والد خواجہ محمد یوسف علی گڑھ میں وکالت کرتے تھے اور وکیلوں کی جماعت کے لیڈر تھے۔ خواجہ عبدالمجید کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی تھی۔ مولویوں نے انھیں اردو، فارسی اور عربی زبانوں کی تعلیم دی تھی۔ بعد کو ان کا داخلہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں کرا دیا گیا تھا۔ وہ ایک ذہین طالب علم تھے اور وہ وطن پرست بھی تھے۔ ۱۹۰۸ء میں وہ کیمبرج کے گریجویٹ بھی ہو گئے۔ بیرسٹری کی سند لے کر ولایت سے وہ ۱۹۱۱ء میں ہندستان واپس آ گئے اور علی گڑھ میں وکالت کرنے لگے۔

خواجہ عبدالمجید کے ہمعصر پنڈت جواہر لال نہرو، تصدق حسین شیروانی، ڈاکٹر سید محمود اور جناب سیف الدین کچلو تھے۔ ۱۹۱۲ء میں آپ کی شادی حیدر آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نواب سربلند جنگ کی صاحبزادی بی بی خورشید سلطانہ سے ہو گئی۔ یہ شادی بہت کامیاب رہی کیونکہ بی بی خورشید سلطانہ ایک نیک اور وفادار بیوی ثابت ہوئی تھیں۔ میاں اور بیوی دونوں ہی قوم و وطن پرست تھے۔

خواجہ صاحب کچھ دنوں نیشنل مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے تھے۔ چونکہ وطن پرستی کا جذبہ خواجہ صاحب میں قدرتی تھا۔ وہ اپنے آپ کو سیاست سے دور نہ رہ سکے۔ ان دنوں کانگریس اور خلافت کا ایک ہی پلیٹ فارم تھا۔ گاندھی جی نے خود کئی بار خلافت کے پلیٹ فارم سے تقریر کی

تھی۔ خواجہ صاحب کانگریس اور خلافت کے سرگرم کارکن بن گئے جس کا جلد ہی انعام بھی مل گیا۔ انھیں باغیانہ تقریر کرنے کے الزام میں چھ مہینے کی سزا ہو گئی۔
بی بی خورشید سلطان نے الہ آباد میں ایک اسکول کھول لیا۔ دونوں پر مہاتما گاندھی کی سادہ زندگی کا اثر تھا۔ لہٰذا وہ بڑی سادگی سے رہتے تھے۔ خواجہ صاحب جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں جامعہ کو ڈاکٹر ذاکر حسین نے سپرد کر دیا گیا تھا۔
خواجہ صاحب الہ آباد کی یک جہتی اور امن وامان قائم رکھنے والی کمیٹی کے بھی موسسین میں تھے۔ وہ علی گڑھ میونسپل بورڈ کے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۶ء تک صدر رہے اور دس برس تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کارکن صدر بھی رہے اور ساتھ ہی اسلامیہ انٹر کالج کے بھی صدر تھے۔ گاندھی جی جب کبھی علی گڑھ تشریف لاتے تو آپ ہی کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۳ء کو آپ نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہا۔

علیگڈھ کے جنگِ آزادی کے دو شیروانی برادران

دونوں شیروانی برادران علی گڑھ کی مایۂ ناز اور ممتاز ہستیوں میں سے ہیں۔ اپنے زمانے میں ان دونوں بھائیوں نے اتر پردیش میں کچھ ایسی ہی شہرت حاصل کی تھی جیسی کہ علی برادران نے حاصل کی تھی۔ کیونکہ دونوں وطن پرست تھے اور وطن کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔
جناب تصدق حسین شیروانی ۱۸۸۵ء میں موضع بلونا ضلع علی گڑھ میں شیروانی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ موضع بھیکم پور کے شیروانی ہائی اسکول سے آپ نے ہائی اسکول کیا۔ اس کے بعد آپ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی اور ۱۹۰۸ء میں گریجویٹ ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے کیمبرج یونیورسٹی لندن سے قانون کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۱۱ء میں بیرسٹر بن گئے۔ بیرسٹر بننے سے پہلے ہی آپ کی شادی اٹیہ ضلع کے ملاہا گاؤں

کے ایک بڑے زمیندار کی صاحبزادی اسرار فاطمہ سے ہو گئی تو یہیں ان کی ملاقات جواہر لال نہرو سے ہو گئی تھی۔ آپ علی گڑھ میں وکالت کرنے لگے۔ آپ سنہ ۱۹۱۲ء میں کانگریس میں شامل ہو گئے سنہ ۱۹۲۱ء کی "عدم تشدد کی تحریک" میں سرگرم حصہ لینے کے جرم میں آپکو قید کر لیا گیا۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں جب گاندھی جی نے "عدم تشدد کی تحریک" بند کر دی تو تمام کانگریس قیدیوں کو رہائی ملی۔ اس کے بعد آپ الٰہ آباد میں وکالت کرنے لگے سنہ ۱۹۲۷ء سے سنہ ۱۹۳۲ تک آپ نے اتر پردیش کانگریس کی صدارت کی۔ آپ نے سنہ ۱۹۲۸-۳۰ء میں لگان بندی تحریک چلائی۔ سنہ ۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرنس سے گاندھی جی واپس آئے تو انھوں نے آپ کو اور جواہر لال نہرو کو بمبئی بلایا۔ ان لوگوں نے ۲۰ میل کا سفر ہی طے کیا تھا کہ دونوں کو گرفتار کر لیا گیا یہ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء کا مہینہ تھا۔ دونوں کو الٰہ آباد سنٹرل جیل میں قید کر دیا گیا۔

تصدق حسین اتر پردیش کی آئین ساز اسمبلی کے نائب صدر بنائے گئے آپ ہی نے شاردا ایکٹ پاس کرایا تھا۔ تصدق حسین شیروانی سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۳۱ء تک پانچ بار جیل گئے تھے۔ وہ سچے مجاہد جنگ آزادی تھے سنہ ۱۹۳۵ء میں ۵۰ سال کی عمر میں دہلی میں آپ کا انتقال ہوا۔

شیروانی خاندان علی گڑھ ضلع کا ایک بہت مشہور خاندان ہے۔ کیونکہ اس خاندان کے لوگوں نے رفاہ عام کے بہت سے کام کئے ہیں اور ہمیشہ غریبوں اور ناداروں کی مدد کی ہے۔ آزادی کی لڑائی میں بھی حصہ لیا ہے۔ چھرا قصبے میں غریبوں کے بچوں کے لیے ایک ہائی اسکول قائم کر دیا ہے۔ اسی اچھر گاؤں میں میرے ایک عزیز ڈاکٹر طے جبار کا انگریزی دواخانہ ہے۔ وہ بھی برابر غریبوں کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ اپنی دوائی کے پیسے غریبوں سے بہت کم یا قطعی نہیں لیتے۔ مریضوں کے گھروں پر جا کر بغیر فیس کے دیکھ بھی آتے ہیں۔ ڈاکٹر جبار کی پوشاک کھادی کی رہتی ہے اور خلق خدا کی خدمت ہی ان کا اصل مذہب ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھیں یہ جذبہ شیروانی

خاندان سے پیدا ہوا جو چھرا کی فضا میں ہے۔

علی برادران

جناب شوکت علی اور جناب محمد علی یہ دونوں بھائی "علی برادران" کے نام سے مشہور ہوئے۔ اور بیسویں صدی کے شروع میں آفتاب و ماہتاب بنکر ہندوستان کے اُفق پر چمکے۔ دونوں بھائی خلافت تحریک کی جان تھے اور خلافت ان کی جان تھی۔ خلافت تحریک ایک مذہبی تحریک تھی جو انگریزی حکومت اور اس کے نظام کے خلاف اٹلی میں خلیفہ کے نام پر شروع کی گئی تھی جہاں کمال پاشا کی حکومت تھی۔ سنہ ۱۹۱۴ء کی عالمی جنگ کے بعد انگریزوں نے اٹلی کا بند بانٹ کر ڈالا تھا کیونکہ اٹلی نے ان کے دشمن جرمنیا کا ساتھ دیا تھا۔ اس پر دنیا بھر کے مسلمان انگریزوں کے خلاف ہو گئے تھے اور پھر انھوں نے انگریزوں کے خلاف جو مہم چلائی وہ خلافت کے نام سے مشہور ہوئی۔ دنیا بھر کا مسلمان بھائی بھائی ہے اس اصول کے مطابق ہندوستان کے مسلمان بھی انگریزوں کے خلاف ہو گئے۔ اور انھیں ہندوستان سے باہر نکالنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ کانگریس بھی ہندوستان کی سرزمین سے انگریزوں کو نکال کر وطنی حکومت قائم کرنا چاہتی تھی۔ اس طرح کانگریس اور خلافت کا نظریہ ایک تھا۔ جب ان دونوں جماعتوں کا نقطۂ نظر یا نصب العین ایک تھا تو پھر ان میں ایکا (تعاون کا) ہونا لازمی امر تھا۔ بس دونوں جماعتوں نے مل کر ہندوستان سے انگریزوں کو ملک بدر کر دینے کی مہم چلائی تھی۔ گاندھی جی نے علی برادران کو جو خلافت کی جان و ایمان تھے، اپنے گلے لگایا اور پھر ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر اپنے ملک کی آزادی کے لیے پسینہ ہی نہیں خون تک بہایا۔ مندر اور مسجد ایک ہو گئے تھے۔ ان دونوں متبرک مقامات پر اب آزادی کے لیے خدا سے دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ سوامی شردھانند جو آریہ سماجی ہندو تھے انھوں نے دہلی کی جامع

مسجد میں تقریر کی تھی۔ افسوس کہ ہندو اور مسلمانوں کی وہ آپسی میل ملاپ کی فضا اب تک نہ بن سکی جس کی ضرورت ملک کو اب آزادی برقرار رکھنے کے لیے اور ملک کو خوش حال بنانے کے لیے اب پہلے سے بھی زیادہ ہے۔
اس معطر فضا کو انگریز ہی مکدر بنا گیا تھا جو ابھی تک بدستور قائم ہے۔ انگریز تو ہمارے پاک ملک کو چھوڑ کر چلا گیا مگر اپنے ناپاک ارادوں کو وہیں چھوڑ گیا۔

دس بارہ سال تک کانگریس اور خلافت کی ملی جلی تحریک زوروں پر چلی مگر انگریز حکومت اس میل ملاپ کو پھوٹی آنکھ بھی نہ دیکھ سکتی تھی کیونکہ یہ میل تو اس کی بقاء کے لیے بہت نقصان دہ تھا۔ لہٰذا اس نے رخنہ اندازی کی اور دونوں جماعتوں کے درمیان نفرت پھیلادی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت اور کانگریس کے مابین اختلاف ہو گیا۔ علی برادران کانگریس سے علیحدہ ہو گئے جب کہ محمد علی جوہر کانگریس کے صدر تھے اور جواہر لال نہرو اس کے جنرل سکریٹری تھے۔ اس زمانے کو اور اس وقت کے میل ملاپ کو لوگ بھول گئے لیکن خلافت تحریک کا زور اس وقت تک رہا جب تک مولانا محمد علی جوہر زندہ رہے کیونکہ خلافت کی وہ ہی ترجمان تھے جب خود انھوں نے ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو اپنی شیریں جان، جان آفریں کے سپرد کر دی تو پھر خلافت بھی بے جان ہو گئی۔

جب ہندوستان میں انگریزوں کے بھڑکانے پر ۱۹۲۴ء میں جگہ جگہ دنگے فساد ہونے لگے تھے تو گاندھی جی نے ۲۱ روزوں کا انشن (فاقہ) کیا تھا۔ اور وہ بھی مولانا محمد علی کی کوٹھی پر۔ لیڈران کی کوششوں سے پھر ایک بار اتحاد ہو گیا مگر اس اتحاد میں پہلے والی کشش کہاں تھی۔

علی برادران ریاست رامپور کے رہنے والے تھے اور انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ شوکت علی کرکٹ ٹیم کے کپتان تھے دونوں بھائیوں کی رام اور لکشمن کی جوڑی تھی۔ جس طرح لکشمن اپنے بڑے بھائی رام سے زیادہ جوشیلے تھے اسی طرح محمد علی بھی اپنے بڑے بھائی شوکت علی سے زیادہ جوشیلے تھے۔ اس امر کی نشانی حسب ذیل ہے:۔

۱۹۳۱ء میں لندن میں گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس میں مولانا محمد علی نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ ان کی غضب کی تقریر ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا تھا "میں لندن آزادی لینے کے لیے آیا ہوں۔ آزادی کا پروانہ لے کر ہی اپنے ملک کو جاؤں گا۔ اگر مجھے آزادی نہیں دو گے تو تمھیں میری قبر کے لیے دو گز زمین تو دینا ہی ہوگی۔ میں آزاد ملک میں مرنا چاہوں گا۔ مجھے ایسی آزادی بھی نہیں چاہیے جو چند آدمیوں کے لیے ہو اور باقی سب غلام رہیں۔ مجھے تو اپنے پیارے ملک کے لیے مکمل آزادی چاہیے۔ اگر وہ نہیں دیتے ہو تو میری قبر کے لیے تھوڑی سی زمین تو دینا ہی پڑے گی۔ اب میں غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔"

مولانا محمد علی کو ذیابطیس کی بیماری تو پہلے ہی سے تھی۔ اس کی وجہ سے اور دوسری بیماریاں پیدا ہو گئیں۔ لیکن محمد علی اتنے سخت جان تھے کہ انھوں نے اپنی بیماری کی کوئی خاص پرواہ نہ کی۔ وہ تو اپنے ملک کی آزادی کے لیے زندہ تھے اور جب وہ انھیں نہ مل سکی تو انھوں نے اپنے قول کے مطابق لندن ہی میں اپنی جان آزادی کے لیے قربان کر دی۔

۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو آزادی کے اس دیوانے نے لندن کی آزاد زمین پر اجل کو لبیک کہا اور فاتح قوم انگریز سے اپنی قبر کے لیے دو گز زمین حاصل کر لی۔ ان کا مزار بیت المقدس میں ہے۔

مشہور مجاہد آزادی مولانا ابوالکلام آزاد

"ہندستان کی جنگِ آزادی کے مسلمان مجاہدین" کتاب مرتب کرتے ہوئے کچھ ایسی مسلم ہستیوں کی سوانح حیات کو پڑھا ہے کہ جن پر کُل ہند کو ناز ہونا چاہیے اور ہندستان اُن پر جتنا بھی فخر کرے وہ جائز ہے اور کم ہے۔ مولانا ابوالکلام ایک ایسی ہی ہستی تھے۔ وہ عالم تو تھے ہی شاعر بھی تھے، ادیب بھی تھے، صحافی بھی تھے، مفکر بھی تھے۔ اور ایک اعلیٰ درجے کے انسان تو تھے ہی، اپنے قول و فعل میں صادق تھے، ہر دکھاوے سے دور تھے

کیونکہ ان کی زندگی عملی زندگی تھی۔ کانگریس کے وہ مضبوط ستون تھے اور کانگریس میں ان کی بڑی عزت تھی۔ مولانا کی علمی قابلیت کو دیکھ کر ہی ان کو آزاد ہند کی نئی پارلیامنٹ کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے وزیر تعلیم بنایا تھا۔ ان دونوں میں بہت گاڑھی چھنتی بھی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان میں حقیقی بھائیوں جیسی محبت تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات پر دوسروں کو اگر رنج ہوا تھا تو جواہر لال نہرو کے دل کو بھی صدمہ پہنچا تھا۔

۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی کا نیا دور ۸ اگست ۱۹۴۲ء کی اُس کانگریس کے جلسے سے شروع ہوا تھا جس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد کر رہے تھے۔ یہ جلسہ بمبئی کے گوالیا ٹینک والے میدان سے شروع ہوا تھا اور اسی جلسے میں گاندھی جی نے "کرو یا مرو" اور "انگریزو بھارت چھوڑو" کا انقلابی نعرہ دیا تھا۔ دوسرے ہی دن علی الصبح سبھی کانگریس کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ مولانا کو احمد آباد کے قلعہ میں نظر بند کیا گیا تھا۔

اس کے پہلے بھی مولانا کو کئی بار گرفتار کیا جا چکا تھا کیونکہ انھوں نے کانگریس کی ہر تحریک میں حصہ لیا تھا اور کُل ملا کر ۱۰ سال ۱۰ مہینے کی برٹش حکومت کی جیلوں میں اپنی زندگی گزاری تھی۔ مولانا آزاد کی مادری زبان عربی تھی کیونکہ ان کی والدہ ایک عربی خاتون تھیں جن سے مولانا کے والد جناب خیر الدین نے مکہ شریف میں رہتے وقت شادی کر لی تھی اور وہیں آزاد کا جنم ۱۸۸۸ء میں ہوا تھا۔ عربی تو مادری زبان ہی تھی۔ مولانا نے فارسی بھی پڑھی تھی اور مہارت حاصل کی تھی۔ بعد کو تو آزاد نے انگریزی اور فرانسیسی بھی سیکھ لی تھی۔ وہ بہت ذہین تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے قرآن شریف کا ایک بہت مقبول ترجمہ "ترجمان القرآن" لکھا ہے۔ انھوں نے عربی اور اردو کے کئی اخباروں کی صحافت کی تھی۔ جس میں الہلال بہت مشہور ہوا تھا۔ اس اخبار کو انھوں نے کلکتہ سے نکالا تھا۔ جب کہ ان کے والدین مکہ معظمہ کو چھوڑ کر کلکتہ میں بس گئے تھے۔

'الہلال' مولانا کے انقلابی خیالات کی ترجمانی کرتا تھا اور ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرتا تھا جو انگریزی حکومت کو کب گوارا ہو سکتا تھا! ۔ ان سے دو بار اس اخبار سے ضمانتیں مانگی گئی تھیں ۔ مولانا الہلال کو ۱۹۱۲ء میں جاری کیا تھا ۔ یہ ہفت روزہ اخبار تھا ۔ اسے بند کر کے مولانا آزاد نے ۱۹۲۱ء میں 'پیغام' نکالا جو جلد ہی بند ہو گیا ۔ انھوں نے ۱۹۲۷ء میں پھر سے الہلال نکالا جو ہلال سے بدر نہ بن سکا ۔ غرضیکہ آزاد ایک بہت بڑے صحافی تھے اور انھوں نے کئی اخبار نکالے تھے ۔ "الہلال" کی اشاعت سے اردو صحافت میں ایک نیا دور شروع ہو گیا تھا ۔ قلیل مدت میں ہی الہلال نے ایک انقلابی تحریک ملک میں پیدا کر دی تھی اور بہت جلد اس نے ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو وفات فرمائی تھی ۔

امر شہید سلیمان شاہ مالیگانوی

مشہور ہفت روزہ اردو بلٹز کے مدیر اعلیٰ جناب حسن کمال اور مدیر جناب اے ایل صاحب کا میں شکر گزار ہوں جنھوں نے مہربانی فرما کر میرا ایک چھوٹا سا مضمون ۱۱ اپریل ۱۹۸۷ء کے شمارے میں شائع کر دیا کہ "میں ہندوستان کی جنگ آزادی کے مسلمان مجاہدین پر ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں ۔ مجھے مجاہدین کے مضامین درکار ہیں ۔ اس خبر کو پڑھ کر جناب غلام صوفی سلیمان شاہ صاحب ولد محمد سلیمان شاہ ، جیسی بلڈنگ مولانا آزاد روڈ بمبئی ۸ نے براہ کرم اپنے والد کے بارے میں لکھ بھیجا جو مالیگاؤں کے مشہور مجاہد جنگِ آزادی تھے ۔

جناب غلام صوفی سلیمان شاہ کے والد جناب محمد سلیمان شاہ ولد جناب روزن شاہ مومن سنہ ۱۸۹۱ء میں اعظم گڑھ (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے تھے ۔ آپ کا خاندان مومن برادری میں بہت ممتاز تھا اور شاہ نام سے مشہور تھا کیونکہ اس خاندان کا اعلیٰ مذہبی کردار تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ خاندان مومن برادری کا امام تھا ۔ آپ کی تعلیم آٹھویں جماعت تک ہوئی

علم جو اُس وقت کافی سمجھی جاتی تھی۔ آپ بہت ذہین اور ہوشیار تھے قومی خدمت کا جذبہ قدرتی تھا۔

اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر ضلع ناسک مہاراشٹر کے مالیگاؤں میں میں آبسے تھے اور یہاں ہوٹل چلانے کا کام کرتے تھے۔

تھوڑے ہی وقت میں آپ کا ہوٹل بہت ترقی کر گیا۔ آپ کے دل میں چونکہ قومی خدمت کا جذبہ تھا۔ اس لیے آپ کانگریس میں کام کرنے لگے۔ بعد ازاں آپ خلافت کی تحریک میں حصہ لینے لگے ۱۹۲۱ء میں کانگریس اور خلافت دونوں تحریکیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ مالیگاؤں میں خلافت تحریک کے آپ سرگرم کارکن ہی نہیں بلکہ لیڈر بھی تھے۔

یہاں سلیمان شاہ کی سرکردگی میں شراب بندی کی مہم چلائی گئی شراب کی ایک دوکان پر پیکٹنگ کے وقت ہنگامہ ہوا۔ اس ہنگامہ میں پولس کا ایک سپاہی ہلاک ہو گیا۔ آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ آپ پر بلوہ کرنے کا جرم عائد کیا گیا اور آپ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ آپ کے ساتھ اسرائیل اللہ رکھا کو بھی گرفتار کیا گیا تھا جو مالیگاؤں میں ہوٹل کا بزنس کرتے تھے۔ اِن دونوں کو پھانسی کی سزا ملی تھی۔ اللہ رکھا کا ذکر ہو چکا ہے۔ اِن دونوں کو ۶ جولائی ۱۹۲۲ء کو صبح ۷ بجے اروڈا (Yerawada) جیل ضلع ناسک (مہاراشٹر) میں بجرم حُب الوطنی پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔

اِس طرح مومن جماعت کے مسلمانوں نے آزادی کی جنگ میں حصہ لے کر اپنی وطن پرستی اور حب الوطنی کا ثبوت دیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مالیگاؤں میں ۳۰ دن تک جناب محمد سلیمان شاہ کی حکومت رہی تھی آپ کا دربار یا کچہری آپ کے ہوٹل میں لگتی تھی اور آپ کے حکم کے سامنے سب اپنا سر تسلیم خم کرتے تھے۔ آپ صوفی خیال کے انسان تھے اور فقیراً

زندگی گزارتے تھے۔ آپ کے ہزاروں مرید تھے۔ وہ آپ کو زلفی بابا کہتے تھے۔

غدری سلمان شاہ نے شہادت پانے کے بعد سات لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی تھی۔ سرکار نے سلمان شاہ نے تمام جائداد ضبط کرکے خاندان کو تباہ کر دیا تھا۔ اس برباد شدہ خاندان کے افراد دھولیہ منتقل ہو گئے۔ دھولیہ میں اس خاندان کے چند رشتہ دار تھے۔ پونے میں ہر سال رجب کے مہینے میں آپ کی یاد میں عرس ہوتا ہے اور میلہ لگتا ہے۔

"شہیدوں کے مزاروں پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پر مرنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا"

بریلی (اترپردیش) کے مجاہد جنگِ آزادی

یہ لکھا جا چکا ہے کہ ہماری پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں شروع ہوئی تھی۔ انقلابیوں نے اس کے لیے ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کی تاریخ مقرر کی تھی مگر آزادی کے دیوانوں کو صبر کہاں تھا۔ انھوں نے ۱۰ مئی کو ہی میرٹھ میں شروع کر دی اور ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو بہت سے باغیوں نے دہلی کے لیے کوچ کیا کیونکہ دہلی کے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اپنا بادشاہ تسلیم کیے ہوئے تھے۔ اور وہ لوگ انھیں جنگ کا سپہ سالار یا خاص لیڈر بنا کر جنگ لڑنا چاہتے تھے۔ جو مقامات دہلی کے قریب تھے وہاں کے باغی انقلابی دوسرے دن تو کوئی تیسرے اور چوتھے دن دہلی پہنچے تھے اور وہاں انھوں نے انگریزوں سے جنگ کی تھی۔

میرٹھ کی ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کی اشتعال انگیز خبروں نے بریلی، پیلی بھیت بدایوں اور شاہجہاں پور وغیرہ میں اشتعال پیدا کر دیا اور جوق در جوق لوگ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ بریلی کے احمد خاں ولد رحمت خاں نے جو اس وقت صدر الصدور کے عہدہ پر فائز تھے جنرل بخت خاں کے مشورے پر بغاوت

کا علم بلند کر دیا۔ بہت سے انگریزوں کو قتل کر دیا گیا اور شہر کے مختلف مقام پر انقلابیوں نے انگریزی فوج کا ساتھ کیا۔ یہ بغاوت کئی دنوں تک چلی تھی اور اس میں بریلی کے کئی وطن پرست مجاہدوں نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ کچھ کے نام حسب ذیل ہیں جنھوں نے کھر کا گاؤں میں ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو احمد خان عرف بہادر خاں کی کمان میں لڑتے ہوئے انگریزوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے اور بریلی۔ پیلی بھیت۔ بدایوں اور شاہجہاں پور سے انھیں بھگا تک دیا تھا۔ مگر بے شرم انگریزی کمک لے کر دوبارہ تیزی سے حملہ کرتا تھا۔ انقلابیوں نے فروری ۱۸۵۸ء تک انگریزوں کے پیر اس علاقے میں جمنے نہیں دئے تھے۔ اس چھوٹے سے مضمون میں صرف موضع کھر کا تحصیل بریلی (اب ضلع بریلی) کے ہی بہادروں کو شامل کیا گیا ہے۔

(۱) کالیخان بھٹی مداری۔ کھر کا گاؤں کا جنے انگریزوں سے لڑتے ہوئے ۵ رمئی ۱۸۵۸ء کو جام شہادت نوش کیا۔

(۲) اعجاز خاں بھٹی مداری نے بھی ۵ رمئی ۱۸۵۸ء کو شہادت پائی تھی۔

(۳) تلو خاں بھٹی مداری نے بھی " " " " "

(۴) عزیز احمد خاں بھٹی مداری بھی کھر کا گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ۶ رمئی ۱۸۵۸ء کو جام شہادت نوش کیا تھا۔

۵: اندر جان بھٹی مداری یہ بھی کھر کا گاؤں (بریلی) کے رہنے والے تھے اور ۶ رمئی ۱۸۵۸ء کو شہادت پائی تھی۔

۶: قاسم خان بھٹی مداری بھی ۶ ر " " " "

۷: شاکر داد خان بھٹی مداری کھر کا گاؤں کے ۶ رمئی کو شہید ہوئے تھے۔

۸: اشرف خاں بھٹی مداری " ۵ " " "

۹: حاجی محراب خاں بھٹی مداری " بھی سخت زخمی ہو گئے تھے اور کچھ دنوں بعد ان کی وفات ہو گئی تھی۔ لیکن یہ جس مقام پر سخت زخمی

ہوئے تھے اور جس سرزمین پر ان کا خون گرا تھا، انھوں نے خاندان والوں کو نصیحت کردی تھی کہ ان کے انتقال کے بعد ان کی قبر اسی مقام پر بنائی جائے۔

نوٹ: حکیم نصرت علیخاں شمسی دواخانہ ٹھریا۔ نجابت خاں ضلع بریلی کی اطلاع کے مطابق، ان تمام شہیدوں کی قبروں کو بطور یادگار انھیں مقامات پر بنادی گئیں جہاں وہ شہید ہوئے تھے۔ کچھ قبروں کے نشانات اب تک موجود ہیں انگریزوں نے پورے گاؤں کو تباہ کردیا تھا۔ بہتوں کو تو پیڑ پر لٹکا کر پھانسی دی تھی۔ پورا گاؤں اُن کے مظالم کی کہانی آج بھی یاد دلاتا ہے۔

چند اور مجاہدین جنگِ آزادی

قطبِ عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ضلع سہارنپور

(۱) قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور (یوپی) میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد کا نام جناب مولانا ہدایت اللہ صاحب انصاری تھا جو پکے اور دیندار عالم اور محب وطن بزرگ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا لائق بیٹا رشید احمد بھی بڑا ہو کر ایک عالم اور قوم و وطن کا خادم بنے اس لیے انھوں نے اپنے بیٹے کو بہت چھوٹی عمر میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی بھیج دیا تھا۔ جہاں وہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی قائم کردہ تحریک آزادی کی تنظیم کے خاص رہنما جناب مملوک علی صاحب سے پڑھتے تھے اور مذہبی تعلیم کے ساتھ سیاسی تعلیم بھی حاصل کرتے تھے۔ وہ انگریزی حکمراں کی چال بازیوں سے واقف ہو گئے تھے۔

زمانۂ طالب علمی ہی میں جناب رشید احمد انصاری کی ملاقات مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی سے ہوئی جو اس مدرسہ میں پڑھتے تھے اور مولانا رشید احمد صاحب ہی کی طرح فہم و ذکا کے لیے مدرسہ بھر میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ اس مدرسہ کی تعلیم کا مولانا رشید احمد گنگوہی

اور مولانا قاسم صاحب نانوتوی پر بہت گہرا اثر پڑا۔
تیلر کے زمانے ہی سے دونوں نے ملک کی آزادی کے لیے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس زمانہ میں ولی اللٰہی مدرسہ پورے ملک کے انقلابیوں کا خاص مرکز تھا۔ انقلابیوں کے بڑے رہنما حاجی امداد اللہ صاحب جو کہ مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم دونوں ہی کے استاد بھی رہ چکے تھے، چاہتے تھے کہ ولی اللٰہی تنظیم کو جلد از جلد انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دینا چاہیئے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک جنگی جماعت بھی تیار کر لی تھی جس میں حاجی امداد اللہ کے علاوہ مولانا عبد الغنی، مولانا محمد یعقوب مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم بھی تھے۔ کچھ دنوں بعد جب حاجی امداد اللہ صاحب کو اس تنظیم کا امام چنا گیا تو یہی چاروں حضرات اس کے مشیر چنے گئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے اپنی فراست و دانائی سے بہت جلد اس تنظیم میں اعتماد حاصل کر لیا تھا۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک مولانا صاحب جگہ جگہ گھوم گھوم کر عوام میں بیداری پھیلاتے رہے۔ وہ ایک مذہبی عالم تھے۔ حدیث میں تو ان کا درجہ اس زمانے کے بڑے بڑے عالم تک مانتے تھے۔

۱۸۵۷ء کا وہ خونیں وقت بھی آ گیا جس کے لیے یہ جماعت پہلے سے ہی تیاریاں کر رہی تھی۔ لیکن ولی اللٰہی تنظیم میں اس وقت کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس انقلاب میں حصہ لینے کے ہی خلاف تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ یہ انقلاب ان لوگوں کی طرف سے شروع کیا گیا ہے جو ملک میں کسی ایک شخص کی بادشاہت چاہتے ہیں جب شاہ ولی اللہ جمہوری حکومت چاہتے تھے، اس لئے اس لڑائی میں حصہ لینا اپنے اصولوں کے خلاف ہوگا۔ اس دلیل کے خلاف حاجی امداد اللہ صاحب یہ فرماتے تھے کہ ہم بھی تو جمہوریت کے حامی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ لیکن انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کے لئے ہمیں انقلاب میں پوری طاقت کے ساتھ حصہ لینا چاہیئے کیونکہ انگریز جب تک یہاں موجود ہیں تب تک یہاں نہ جمہوریت قائم ہو سکتی ہے اور نہ شاہ

صاحب کے دوسرے اصولوں کو ہی عمل میں لایا جا سکتا تھا۔ اعتراض کرنے والوں کو حاجی امداد اللہ کے اس جواب سے تسکین نہ ہوئی لیکن مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم دونوں حضرات اپنے استاد کی بات سے متفق تھے۔ دونوں نے اس آزادی کی لڑائی میں عملی حصہ لیا اور اپنی قربانی دی۔

اپنے استاد اور امام جناب حاجی امداد اللہ کے ساتھ دونوں صاحبان بھی شاملی کے مورچہ پر انگریزی فوجوں کے ساتھ بڑی دلیری سے لڑے اور تب تک لڑتے رہے جب تک وہ لڑائی میں زخمی ہو جانے کی وجہ سے پکڑ نہیں لیے گئے۔ انھیں جیل میں بند کر دیا گیا۔ جیل خانہ میں مولانا رشید احمد کو بڑی سخت تکلیفیں دی گئیں۔ اس وقت لڑائی میں پکڑے ہوئے ہزاروں قیدی انگریزوں کے پاس تھے جن کے کھانے پینے کا انتظام نہ تو ہو ہی سکتا تھا اور نہ انگریزوں کو اس کی پرواہ تھی۔

ان قیدیوں کے مقدمات بڑی تیزی کے ساتھ نپٹائے جا رہے تھے زیادہ تر لوگوں کو پھانسی پر چڑھا کر ٹھکانے لگا دیا جاتا تھا۔ مولانا رشید احمد بھی جانتے تھے کہ انھیں بھی پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ ثبوت کے لیے ان کے جسم پر گولیوں کے نشان جو تھے، جو ان کو بغاوت میں حصہ لینے کی نشاندہی کرتے تھے۔ لیکن وہ بے خوف تھے، اپنے پیارے وطن کے لیے جان دینے کو تیار تھے۔ افسوس انھیں صرف اس بات کا تھا کہ آپسی پھوٹ اور نا اتفاقی کی وجہ سے جنگ آزادی میں انھیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ گنگوہی صاحب بڑے نیک انسان تھے۔ انھوں نے اپنی پرجوش تقریروں سے ہزاروں مسلمانوں کو آزادی کا سپاہی بنا دیا تھا لیکن اس کہاوت کے مطابق۔ "اللہ جس کو رکھے اُسے کون چکھے۔" انھیں تو ابھی اپنی قوم اور وطن کے لیے زندہ رہنا تھا۔ برٹش کی مہارانی وکٹوریہ نے غدر کے بعد عام معافی کا اعلان کر دیا تو سب قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ مولانا رشید احمد وہ خوش قسمت قیدی تھے کہ ان کے مقدمہ کا نمبر آنے کے

پہلے ہی عام معافی کا اعلان ہو گیا تھا اور وہ پھانسی پر چڑھنے سے صاف بچ گئے بس جان بچی تو لاکھوں پائے، خیر سے اپنے گھر لوٹ آئے۔

جیل سے باہر آ کر رشید احمد نے پھر اپنا کام شروع کر دیا۔ یہ معلوم کر کے ان کو بہت خوشی ہوئی کہ حاجی امداد اللہ بخیریت مکہ پہنچ گئے ہیں۔ اب مولانا گنگوہی اور مولانا قاسم دونوں نے اس بات پر غور کیا کہ جنگ آزادی کو کس طرح جاری رکھا جائے۔ ادھر مولانا گنگوہی کی خط و کتابت حاجی امداد اللہ سے شروع ہوئی۔ ان کے ساتھ صلاح و مشورہ ہوا اور جنگِ آزادی کا کام جاری رہا۔

جناب حاجی امداد اللہ صاحب کے مشورہ سے مولانا رشید احمد گنگوہی نے ولی اللہی تنظیم کو دوبارہ زندہ کیا۔ اب اس میں بجائے تلوار کے قلم سے کام لینے والے سپاہی تیار کئے جانے لگے۔ مولانا کی پرجوش تقریروں اور دل نشین تحریروں نے جہاں ان کے شاگردوں کو متاثر کیا جو سیکڑوں کی تعداد میں جذبۂ آزادی کے آرزومندوں کی جماعت کانگریس میں شامل ہو گئے۔ نمایاں کام کئے اور جیلوں میں گئے اور تکالیف برداشت کیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کا انتقال ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء کو ہوا۔ وہ ۹۹ سال کے تھے۔

(۲) مولانا حافظ محمد یوسف انصاری گنگوہی

مولانا حافظ محمد یوسف انصاری، یہ مولانا گنگوہی کے نواسے تھے۔ مولانا حافظ محمد یوسف انصاری نے پہلے دیوبند اور پھر علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی اور سرکاری نوکری بھی کی۔ جب گاندھی جی کی عدم تشدد کی تحریک ۱۹۲۱ء میں شروع ہوئی تو حافظ محمد یوسف انصاری نے اپنی نوکری چھوڑ دی اور وہ اس تحریک میں کود پڑے اور برابر تندہی سے اس میں کام کیا اور اپنے نانا مولانا گنگوہی کی طرح دوسروں کو بھی تحریک میں کام کرنے کے لیے ترغیب دیتے رہے اور شہر سہارن پور میں جنگِ آزادی کے کاموں میں مصروف رہے۔ ان کے خلاف کئی بار گرفتاری کے وارنٹ بھی جاری ہوئے مگر وہ فرار ہوتے رہے

کیونکہ جو کام وہ کر رہے تھے وہ کام جیل میں رہ کر نہیں ہو سکتا تھا لیکن
اس محبِ وطن کا انتقال ۱۹۴۳ء میں ہو گیا

(۴) مولانا خالد سیف اللہ انصاری گنگوہی

یہ مولانا گنگوہی کے پوتے، حضرت مولانا حافظ محمد یوسف انصاری
گنگوہی کا نو عمر بیٹا حافظ خالد سیف اللہ انصاری ابھی اپنی تعلیم سے فارغ بھی
نہیں ہوا تھا کہ وہ آزادی کی تحریک کا ایک پُرجوش کارکن بن گیا۔ ۱۹۴۲ء کی
"انگریز ہندوستان چھوڑو" تحریک میں خالد سیف اللہ انصاری اپنے استاد
حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحب (مولانا رشید احمد گنگوہی کے شاگرد)
کے داہنے ہاتھ تھے۔ اُن ہی کے ساتھ گرفتار ہوئے۔ ڈیڑھ سال تک سہارنپور
اور میرٹھ کی جیلوں میں رکھے گئے۔ انھوں نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء حصولِ
آزادی کے دن تک کام کیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا حافظ محمد یوسف
اور مولانا خالد سیف اللہ انصاری دونوں باپ بیٹوں نے جنگِ آزادی میں
حصہ لیا تھا اور دونوں نے مجاہدینِ جنگِ آزادی کا شرف حاصل کیا تھا۔
اس طرح سے میں دیکھتا ہوں کہ اتر پردیش کے کئی ممتاز مسلمان خاندانوں نے
(انصاری، شیروانی اور قدوائی وغیرہ) نے جنگِ آزادی میں نمایاں
حصہ لیا تھا۔

بمبئی کے مجاہد جنگِ آزادی

سید محمد حسین زیدی

سید محمد حسین زیدی ۱۹۱۷ء میں جون پور (اتر پردیش)
میں پیدا ہوئے تھے آپ کے والد کا نام سید مقبول حسین تھا۔ آپ نے
اردو، ہندی، اور انگریزی زبانوں میں آٹھویں کلاس تک تعلیم حاصل

کی تھی۔ حب الوطنی کا جذبہ آپ کے دل میں پہلے ہی سے تھا لیکن
آزادی کی کسی تحریک سے منسلک نہ تھے۔ مگر جب آزادی کی تحریک
نے زور پکڑا تو آپ ۱۹۳۹ء میں کانگریس کی "عدم تشدد" کی
شخصی تحریک میں شامل ہو گئے۔ کانگریس میں کام کرنے کا آپکو
انعام بھی ملا۔ آپ کو فروری ۱۹۴۲ء میں چھ مہینے کے لئے جیل بھیج
دیا گیا اس طرح آپ فروری ۱۹۴۲ء سے جولائی ۱۹۴۲ء تک جیل
خانے کے مہمان رہے۔ لیکن رہائی کے بعد پھر کانگریس کے کام میں
لگ گئے۔

ہوا یہ تھا کہ ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو جب گاندھی جی نے انگریزو بھارت
چھوڑو کا نعرہ بمبئی کے گوالیا ٹینک کے میدان سے دیا تھا تو ۹ اگست کو
علی الصبح ہی کانگریس کے تمام لیڈران گرفتار کر لیے گئے تھے اور اس خبر
سے بمبئی شہر مشتعل ہو گیا تھا۔ توڑ پھوڑ کی کارروائیاں شروع ہو گئی تھیں۔
گوالیا ٹینک کے میدان میں پھر جلسہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ محترمہ سچیتا کرپلانی
نے ترنگا جھنڈا پھرایا جسے پولس نے فوراً اتار دیا۔ بعد ازاں دوپہر کو محترمہ
ارونا آصف علی نے ترنگا جھنڈا پھرایا اور بندے ماترم کا گیت گایا۔ پولس
نے پھر ڈنڈے برسائے تو بھگدڑ مچ گئی۔ شری سید محمد حسین زیدی کے
جب لڑکوں کے ساتھ کینیڈی برج پر پہنچے تو پولس نے گولی بھی چلائی۔
ایک گولی محترمہ نرگس باٹلی والا کے پیر کو زخمی کر گئی۔ اسی دن شام کو
میونسپل دفتر پر ایک بم پھینکا گیا۔ پولس نے پھر گولی چلائی جس سے مسٹر
نرسیا وہیں ہلاک ہو گئے۔ ایک گولی زیدی صاحب کے داہنے کاندھے کے
پیچھے لگی اور زخمی ہو گئے۔ اس زخم کی مرہم پٹی مدن پورہ کے حکیم عبدالغنی
صاحب نے کی تھی مگر زیدی صاحب زخمی ہو کر گھر میں بیٹھنے والے نوجوان
نہیں تھے۔ وہ تو وطن کی آزادی کے لیے سر پر کفن باندھے قاتل کی
تلاش میں گھوم رہے تھے۔ ۱۱ اگست ۱۹۴۲ء کو آپ کو پولس نے جیل

پہنچادیا تھا اور اب کی بار آپ ایک سال تین ماہ اور ۴ دن تک جیل خانہ کے مہمان رہے اور قید کی تمام صعوبتوں کو بطیب خاطر قبول کیا۔ اب کی بار آپ کی گرفتاری کا حادثہ اس طرح عمل میں آیا تھا کہ آپ اپنے زخم پر پٹی باندھے ہوئے پبلک کی اُس بھیڑ میں شریک تھے جو بمبئی سنٹرل اسٹیشن کے قریب جمع ہوکر توڑ پھوڑ کے کاموں میں لگی ہوئی تھی۔ پولس نے یہاں بھی گولی چلائی تھی اور یہاں بھی کچھ لوگ نے شہادت پائی تھی بہت سے لوگوں نے وہیں گرفتار بھی کر لیا گیا۔ اسی وقت سید محمد حسین زیدی صاحب کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا اور بغاوت کے جرم میں آپ کو بھی جیل میں بھیج کر شاہی مہمان بنا لیا گیا تھا۔

جناب سید حسین زیدی نے اپنی مالی مشکلات کا مقابلہ جس ہمت اور خودداری کے ساتھ کیا ہے وہ ایک لمبی کہانی ہے۔

آپ اپنے وطن کے دوست ہیں اور قومی یکجہتی کے علمبردار ہیں اس وقت یعنی مئی ۱۹۸۶ء میں جبکہ میں "ہندستان کی جنگِ آزادی کے مسلمان مجاہدین" کتاب کو ترتیب دے رہا ہوں آپ کی عمر ۶۲ سال ہے۔ زیدی صاحب فی الحال بمبئی ۴۰۰۱۰۴ کے گورے گاؤں میں تشریف رکھتے ہیں۔ ۲ جون سنہ ۱۹۸۶ء کے دن بوقت شام زیدی صاحب خود میرے مکان پر تشریف لائے۔ آتے ہی وہ میرے گلے سے لگ گئے۔ میں نے انھیں عید کی مبارکباد دی۔ میرے ساتھ انھوں نے مختلف موضوع پر کافی دیر تک گفتگو کی اور جاتے ہوئے قومی یکجہتی، حب الوطنی اور اپنے نہایت شریف انسان ہونے کا دائمی اثر میرے دل پر ثبت کر گئے۔

بمبئی کے چار مینار

"ہندستان کی جنگِ آزادی کے مسلمان مجاہدین" کتاب کے اس باب میں بمبئی کے چوٹانی خاندان کے ان چار میناروں کا مختصر ذکر ہے جن پر اہلِ بمبئی کو ناز تھا۔ جنھوں نے جنگِ آزادی میں نمایاں حصہ لے کر ہمیشہ

برادری کو وہ عزت بخشی کہ جسے کبھی معدوم نہیں کیا جاسکتا اور کانگریس اور خلافت کو وہ عظمت اور تقویت پہنچائی کہ جسے کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ ان عظیم ہستیوں کو بھلے ہی لوگ بھلا دیں۔ اس خاندان کے چشم و چراغ جناب فاروق چھوٹانی کا میں شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے اس خاندان کے بارے میں مجھے روشناس کرایا۔ یہ چار عظیم ہستیوں مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) سیٹھ دادا عبداللہ (ڈربن)۔ (۲) نصیر الاسلام حاجی میاں محمد چھوٹانی (بمبئی) (۳) سیٹھ عمر سبحانی (بمبئی) اور (۴) سیٹھ ہند سیوک عبدالحبیب (مارخانی) ان میں سے پہلے تین نام وہ ہیں جنھوں نے کانگریس اور خلافت کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا تھا اور وطن پرستی پر اپنے کو نثار کردیا یہ لوگ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے پیروکار تو تھے ہی وہ مہاتما گاندھی کے بھی پیروکار تھے اور اس طرح انھوں نے ہندو مسلم یکجہتی کا پرچم بلند کیا تھا۔ سیٹھ دادا عبداللہ نے گاندھی جی کو ڈربن (افریقہ) بلالیا تھا۔ وہاں ہندوستانیوں کی حالت بہت زیادہ خستہ تھی اور انگریز انھیں نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ غلامی کرنے کے علاوہ انھیں کوئی اختیار نہیں تھا۔ سیٹھ عبداللہ کی مالی مدد سے گاندھی جی نے ہندوستانیوں کو کچھ حقوق دلانے کی کوشش کی اور ان کے حالات بہتر بنائے۔ افریقہ میں رہ کر گاندھی جی نے اپنے بھائیوں کے لیے جو کام سیٹھ عبداللہ کی مدد سے کیے ان کے کاموں نے ہی موہن داس کرم چند گاندھی کو مہاتما گاندھی بنا دیا تھا۔

(۲) نصیر الاسلام حاجی میاں محمد چھوٹانی نے تو کانگریس اور خلافت کو اتنی زیادہ مالی امداد پہنچائی کہ اپنے کو برباد ہی کر ڈالا تھا۔ وہ کروڑوں روپیوں کے آدمی تھے مگر کوڑیوں سے رہ گئے۔ امیر تھے مگر فقیر ہو کر رہے۔ مجاہد جنگ آزادی ہونے کا ان کا یہ ثبوت ہے۔

(۳) میمن برادری کے سیٹھ عمر سبحانی بھی ایک عظیم ہستی تھے۔ یہ ایک مِل مالک ہوتے ہوئے بھی ملک کی آزادی کے لیے کام کرتے تھے جب ان کے سامنے کانگریس کو ایک کروڑ روپیہ چندہ دینے کی بات آئی تو

سبحانی صاحب نے گاندھی جی کو اپنی پوری چیک بک پکڑا دی اور کہا۔ آپ کے مزاج میں جو آئے اتنی رقم اس چیک پر لکھ دیجئے۔ انشاء اللہ اس رقم کے دینے میں مجھے قطعی عذر نہ ہوگا۔ گاندھی جی نے چیک پر ایک لاکھ روپے کی رقم لکھ دی۔ اس دریا دلی کی کیا اور بھی کوئی مثال ہے۔

(۴) جناب ہندسیرک عبدالحبیب مارفانی نے جو رنگون میں اپنی تجارت کرتے تھے۔ نیتا سبھاش چندر بوس کو اس قدر زیادہ مالی اور دیگر امداد پہنچائی کہ نیتا جی نے خوش ہو کر انھیں ہندسیرک کا تعظیمی خطاب عطا فرمایا تھا۔ اس طرح ان چار عظیم ہستیوں نے میمن برادری کو سرخرو بنایا جنھیں ہم میمن برادری کے چار مینار کہتے ہیں۔

مشہور مجاہدِ جنگ آزادی

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی

اٹھارہویں صدی کے سلطان درویش شاہ ولی اللہ ایک مدرس صفت ہوتے ہوئے بھی ایک دور اندیش سیاست داں بھی تھے۔ ملک میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے خطروں کو انھوں نے جان لیا تھا۔ اور پھر ہندستان کو ان خطروں سے بچانے کے لیے وہ زندگی بھر کوشش کرتے رہے اور اپنے بیٹوں اور ناتیوں اور ہزاروں شاگردوں کے دلوں میں ایسی آگ چھوڑ گئے کہ انھوں نے مرجانا پسند کیا لیکن ہندستان کی غلامی کو برداشت نہیں کیا۔ وہ صرف درویش ہی نہیں بلکہ سچے کرانتکاری (انقلابی تھے)۔

شاہ ولی اللہ دہلی کے ایک مشہور درویش خاندان میں ۱۷۰۳ء میں (بادشاہ اورنگ زیب کے زمانے میں) پیدا ہوئے تھے۔ والد کا نام شاہ عبدالرحیم تھا جو بہت بڑے عالم اور صوفی تھے۔ ان میں مذہبی تعصب بالکل نہیں تھا۔ ان کے لیے سبھی انسان برابر تھے۔ یہی سب اوصاف ان کے لائق اور ہونہار بیٹے شاہ ولی اللہ نے اختیار کر لیے تھے۔ انھوں نے بہت

اور یہی مذہبی تعلیم پائی تھی۔ اور اسی تعلیم نے ہی انھیں سچا صوفی درویش بنا دیا تھا۔ سچا خادم خلق۔

اورنگ زیب کے ۱۷۰۷ء میں وفات پانے کے بعد ملک کی فضا بگڑ گئی تھی۔ بہت سی آزاد حکومتیں صوبے صوبے میں بٹ گئی تھیں۔ شاہ ولی اللہ نے دیکھا کہ راجاؤں اور نوابوں کے آپسی جھگڑوں سے انگریز اور فرانسیسی اپنا اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ راجدھانی دہلی میں دن رات سازشیں چلتی رہتی تھیں۔ شاہ صاحب اپنے ملک کی بگڑتی حالت کو دیکھ کر سکونِ قلب کے لئے بھی اور دیگر ملکوں کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے مکہ شریف تشریف لے گئے۔ وہ وہاں دو سال تک رہے۔

ہندستان واپس لوٹ کر شاہ ولی اللہ اپنی کوشش میں لگ گئے کہ یہاں ہر مذہب کے لوگ امن سے رہیں اور اپنی جمہوری سلطنت بنائیں۔ جہالت پسند ملاؤں اور مولویوں نے ان کی مخالفت کی اور انھیں قتل کر ڈالنے تک کی کوشش کی۔ شاہ صاحب نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں انھوں نے اپنے انقلابی پروگرام بیان کئے ہیں۔ وہ ہندستان کو ایشیا کا ایک طاقتور ملک دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ایک جیسا قانون چاہتے تھے اور وہ مزدوروں یا کمزوروں کا استحصال بالکل نہیں چاہتے تھے۔ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ۵ مئی ۱۷۳۱ء کو انھوں نے باقاعدہ ایک جماعت بنائی جس کا مقصد ہندستان میں ایک سیاسی انقلاب لانا تھا۔ اس جماعت کا نام جمعیۃ مرکزیہ (سنٹرل کمیٹی) رکھا۔ ملک کے بہت سے حصوں میں اس کی شاخیں قائم کی گئیں ملک میں سیاسی انقلاب لانے کی زور دار کوشش چل رہی تھیں۔ دہلی کے ایک حاکم بخت علی خان نے شاہ صاحب کے ہاتھوں کے پنجے اتروا دئے تاکہ وہ کتابیں لکھ کر انقلابی، سیاسی پرچار نہ کر سکیں ان کے دونوں بیٹوں شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو سلطنت کے باہر نکلوا دیا گیا۔ اتنے بڑے ظلم کو برداشت کر کے بھی انھوں نے اف تک نہ کی۔

۱۷۶۲ء میں اپنی جماعت کا تمام کام اپنے بیٹے شاہ عبدالعزیز کے سپرد کر کے انھوں نے اپنی جان خدا کو سپرد کر دی جس ہندستان کا نقشہ انھوں نے

اپنے ذہن میں بنایا تھا اُسے وہ نہ دیکھ سکے مگر ان کی انقلابی جماعت ملک کے آزاد ہو جانے تک برابر کام کرتی رہی۔ دیوبند کا مدرسہ اور جمعیۃ العلماء شاہ ولی اللہ کی جمعیۃ مرکزیہ کی ہی دین ہیں۔ شاہ ولی اللہ سے کر مولانا حسین احمد مدنی تک کا یہ سلسلہ ایک ایسی تاریخ ہے جس کا ہر صفحہ شہیدوں کے خون سے لال ہے اور ان پر ملک جتنا بھی ناز کرے وہ کم ہے۔ شاہ ولی اللہ کی جماعت ہی ملک میں سب سے پہلی انقلابی جماعت تھی۔

مشہور مجاہد جنگ آزادی

شاہ عبدالعزیز

۱۷۶۲ء میں شاہ ولی اللہ کے انتقال کے بعد ان کے لائق پسر شاہ عبدالعزیز والد کی تحریک۔ سوشلسٹ ڈیموکریٹک حکومت کے امام بنے اس وقت ان کی عمر کل ۱۷ سال کی تھی۔ شاہ ولی اللہ کے ساتھیوں میں مولانا محمد عاشق پھلتی۔ مولانا محمد امین کاشمیری، مولوی نور اللہ برہانوی تھے جنہوں نے شاہ عبدالعزیز کی امامت کی پیروی کی تھی اس لیے کہ وہ شاہ عبدالعزیز بڑے قابل اور ہونہار نوجوان تھے مگر اس وقت کی سرکار کو آزادی پسند نوجوان کی نہیں غلام نوجوانوں کی ضرورت تھی اس لیے دشمنوں نے ان کو دو بار زہر دیا مگر جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ یہ زندہ رہے۔ ایک بار تو چھپکلی کا خون ان کے جسم سے ملوایا گیا جس سے ان کو کوڑھ ہو گیا مگر وہ بیماری کی حالت میں بھی اپنے اصولوں پر عمل کرتے رہے تو انھیں دہلی سے جلاوطن کر دیا گیا اور حکم ہوا کہ فلاں مقام تک انھیں پیدل ہی جانا ہوگا۔ تیز دھوپ تھی۔ حکم حاکم ان کی آنکھوں کی روشنی چلی گئی۔ انقلابی راستوں کی پریشانیوں سے وہ خوب واقف تھے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں۔

دیش نکالے کی میعاد ختم ہونے پر پھر واپس دہلی آ گئے اور تعلیم و تعلم

کا سلسلہ شروع کیا۔ دہلی میں انگریز ریزیڈنٹ رہتا تھا جو بادشاہ کی کمزوری کا خوب فائدہ اٹھاتا تھا۔ بنگال اور بہار کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو سونپ دی گئی تھی۔ ملک کے راجہ اور نواب انگریزوں کے غلام بن چکے تھے۔ شاہ عبدالعزیز نے ان تمام جگہوں کو جہاں جہاں تک انگریزوں کا اقتدار تھا، شاہ دارالحرب قرار دیا۔ یعنی وہ جگہیں کافروں کی ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ لوگ تلوار اٹھا کر انگریزوں کا مقابلہ کریں۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔

انقلاب کی تیاریوں کے لیے انھوں نے ایک بورڈ بنایا۔ اس کے صدر شاہ صاحب کے شاگرد سید احمد بریلوی تھے اور نائب صدر شاہ صاحب کے بھتیجے شاہ اسمٰعیل اور داماد مولانا عبدالحی بنائے گئے۔ اس بورڈ نے ملک میں خوب انقلاب کا پرچار کیا۔ اس وقت پنجاب میں راجہ رنجیت سنگھ کی حکومت تھی جو انگریزوں کا دوست تھا۔ شاہ صاحب اس کی مخالفت کے لئے تیار ہو گئے۔ انگریز تو ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑا دینا چاہتا تھا اس لئے کبھی سکھوں کی مدد کرتا تو کبھی سکھ دشمنوں کی۔ اصل میں انگریز پنجاب کی حکومت کو ہی ختم کر دینا چاہتے تھے۔

شاہ صاحب ایک بڑے جتھے کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہو گئے تو سکھوں کے ساتھ ان کی لڑائی بند ہو گئی۔ اس کے دو سال بعد ہی یعنی ۱۸۲۴ء میں شاہ صاحب ۸۰ سال کی عمر میں راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے۔

شاہ عبدالعزیز اپنے انتقال کے پہلے ہی یہ وصیت کر گئے تھے کہ ان کا کفن دفن بہت سادگی سے کیا جائے۔ وہ تو ہمیشہ موٹا، جلاہوں کا بنا کپڑا پہنا کرتے تھے۔ ریشمی اشیاء کو ہاتھ تک نہ لگاتے تھے۔ اپنے کفن تک کے لیے کھدر کی وصیت کر گئے تھے۔ اور یہ بھی کہہ گئے تھے کہ جنازہ اٹھانے کے لیے بادشاہ کو مدعو نہ کیا جائے۔ ان سب باتوں کے باوجود ان کا جنازہ اس شان سے اٹھا تھا کہ وہ شان بادشاہ کو بھی نصیب نہ ہوئی۔ اس وطن پرست، خادمِ خلق اور فقیر درویش کے جنازے میں اتنی زیادہ بھیڑ تھی کہ جنازے کی نماز پچپن بار پڑھی گئی تھی۔ باپ شاہ ولی اللہ اور بیٹا شاہ

عبدالعزیز دونوں ہی سچے انقلابی تھے اور وطن کی آزادی کے لیے جو آگ انھوں نے جلائی تھی۔ وہ ان کے ہم نشین نے تب تک بجھنے نہ دی جب تک ہمارا ملک ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو مکمل طور پر آزاد نہیں ہو گیا۔

مشہور مجاہد جنگِ آزادی

شاہ محمد اسحاق

شاہ محمد اسحاق صاحب نے شاہ ولی اللہ صاحب کی انقلابی تحریک کو علمی جامہ پہنانے کا کام کیا ہے۔ انھوں نے اسے بہت کچھ سیاسی لباس پہنا دیا تھا۔ جب شاہ عبدالعزیز ۱۸۲۴ء میں اس دنیا سے چل دیے تو شاہ محمد اسحاق تیسرے امام مقرر ہو گئے۔ رشتہ میں وہ شاہ عبدالعزیز کے دھیوتے تھے۔ ان کا پڑھنا لکھنا سب اپنے نانا کے مدرسہ میں ہوا تھا اور مدرسہ کے انقلابی رنگ میں رنگ گئے تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے ایک فوجی بورڈ بنایا۔ اس بورڈ کے صدر سید احمد صاحب تھے۔ ممبران میں مولانا عبدالحی اور شاہ اسمٰعیل تھے۔ اس کے علاوہ انقلاب کے پرچار کے لیے ایک دوسرا بورڈ بنایا گیا جس کے صدر خود شاہ محمد اسحاق تھے۔ اسی طرح اپنی زندگی ہی میں شاہ عبدالعزیز اپنے پیارے دھیوتے کو ملک کے لیے ایک ایسی جماعت کی سرداری کا کانٹوں بھرا تاج پہنا گئے تھے۔

۱۸۲۴ء میں شاہ محمد اسحاق نے اس انقلابی تحریک کی کمان اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ دہلی کے تخت پر اس وقت اکبر شاہ ثانی تھے وہ برائے نام ہی بادشاہ تھے۔ کام سب انگریزی ریزیڈنٹ چارلس مٹکاف کے اشارے پر ہوتا تھا۔

چالاک انگریز ہندستانی ریاستوں کو ایک دوسرے سے لڑوا رہے تھے عیسائی پادری لوگوں کو عیسائی بنا رہے تھے۔ ہندی اور مسلمان پیغمبروں کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ شاہ محمد اسحاق کو ابھی امامت کی گدی سنبھالے کچھ ہی عرصہ

ہوا تھا کہ سید احمد بھی حج سے واپس آگئے۔ انھوں نے بھی شاہ محمد اسحاق کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔ سید احمد صاحب سکھوں کے ساتھ لڑتے ہوئے ۱۸۳۱ء میں مارے گئے تھے۔

سید احمد صاحب کے بعد شاہ ولی اللہ کی انقلابی پارٹی میں دو دل ہو گئے تھے۔ ایک طرف شاہ محمد اسحاق اور ان کے خیال کے لوگ جو انگریزوں کو ملک کا دشمن مانتے تھے۔ دوسری طرف صادق پور کے مولانا ولایت علی اور ان کے ساتھیوں کی رائے تھی کہ سکھوں کے خلاف لڑائی جاری رکھی جائے لیکن شاہ اسحاق کی پارٹی کا ہی زور رہا۔ اس لیے مولانا ولایت علی مرکزی کمیٹی سے الگ ہو گئے۔ اب اس تحریک کا سیدھا مورچہ انگریزوں کے خلاف تھا۔

شاہ محمد اسحاق نے اب ایک نیا پروگرام بنایا۔ انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے مولانا مملوک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی، مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی اور مولانا عبدالحئی کا ایک بورڈ بنا کر وہ خود مکہ تشریف لے گئے۔ وہاں انھوں نے ترکی حکومت کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ اور حکومت ترکی کی مدد سے وہ انگریزوں کو ہندستان سے نکال دینا چاہتے تھے۔ کچھ دنوں بعد ہی انگریزوں کو شاہ محمد اسحاق کی کوششوں کا پتہ چل گیا۔ انگریزوں نے ترکی حکومت پر زور ڈالا کہ وہ شاہ محمد اسحاق کو ملک بدر کر دے۔ ان کے اوپر مصیبت آ پڑی۔ ترکی کے ایک شیخ اکرام نام کے شخص کی مدد سے انھیں حجاز میں رہنے کی اجازت مل گئی۔

دہلی کا بورڈ انگریزوں کی نظروں سے بچا رہا کیونکہ اس کے صدر مولانا مملوک علی تھے جو دہلی کالج کے پروفیسر تھے۔ مگر جب اسحاق صاحب نے دیکھا کہ کچھ زیادہ کام نہیں ہو رہا ہے تو انھوں نے ان کی جگہ حاجی امداد اللہ کو دیدی۔ یہ وہی حاجی امداد تھے جنھوں نے شاملی کی جنگ میں انگریزوں کے دانت کھٹے کر دئے تھے۔ لاکھ کوششوں کے بعد بھی انگریز انھیں گرفتار نہیں کر سکے تھے۔ ابھی شاہ محمد اسحاق حجاز میں ہی تھے کہ ۱۸۴۶ء میں ان کا وہیں انتقال ہو گیا۔

اسحاق صاحب سرتاپا انقلابی تھے اور انھوں نے عمر بھر انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی تھی، اور اپنی جماعت کا نام روشن کیا تھا۔

مشہور مجاہدِ جنگِ آزادی

حاجی امداد اللہ صاحب

۱۸۴۶ء میں ولی اللہی جماعت کے تیسرے امام شاہ محمد اسحاق صاحب کا جب انتقال مکہ میں ہو گیا تو اس انقلابی جماعت کے چوتھے امام حاجی امداد اللہ بنے۔ ۱۸۴۱ء میں شاہ محمد اسحاق صاحب کے مکہ چلے جانے کے بعد ہندوستان میں جماعت کے کام کے نگراں حاجی امداد اللہ ہی تھے جو اسحاق صاحب کی نظروں میں پہلے ہی کھٹکے سے تھے۔

حاجی امداد اللہ صاحب کی پیدائش ۱۸۲۱ء میں قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور میں ہوئی تھی۔ بچپن کا نام امداد حسین تھا۔ پڑھنے میں بہت تیز تھے۔ خوش قسمتی سے آپ کو شیخ نور قلندر اور شیخ الٰہی بخش صاحب کاندھلوی جیسے قابل استاد مل گئے تھے۔ انھوں نے ان کو حب الوطنی کا سبق پڑھایا۔ انھیں استادوں کی بدولت ان کی رسائی شاہ ولی اللہ صاحب کی انقلابی جماعت میں ہوئی تھی۔ شروع میں ان کا تعلق سید احمد صاحب بریلوی سے ہوا تھا جو سرحد پر انگریزوں سے جنگ کر رہے تھے لیکن ۱۸۳۱ء میں جب سید احمد صاحب بالاکوٹ کی لڑائی میں شہید ہو گئے تھے تو آپ نے اب دہلی کے مدرسہ سے پھر سے اپنا رابطہ قائم کر لیا۔ سید احمد دہلی کے مدرسہ سے اپنی الگ ہی پارٹی بنا کر کام کر رہے تھے اور سکھوں سے جنگ کر رہے تھے۔

لیکن حاجی امداد اللہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ملک کے اصلی دشمن سکھ نہیں انگریز ہیں۔ ہمیں انھیں کے خلاف جنگ لڑنا چاہیے۔ اس وقت سکھوں اور انگریزوں میں گہری دوستی تھی۔ اس خیال کو لے کر جب وہ ۱۸۴۱ء میں دہلی پہونچے تب تک شاہ اسحاق مکہ کے لیے روانہ ہو چکے تھے اور وہ دہلی میں اپنی جماعت کی طاقت بڑھانے میں لگے ہوئے اور ایک سال تک وہ وہاں شاہ محمد اسحاق کے ساتھ رہے اس لمبی ملاقات کا یہ اثر ہوا کہ اسحاق صاحب نے حاجی امداد اللہ کو اپنا نائب صدر مقرر کر دیا۔ حاجی امداد اللہ صاحب ہندوستان واپس

آ گئے۔ ۱۸۴۶ء میں حاجی شاہ محمد اسحاق صاحب کا مکہ میں ہی انتقال ہو گیا تو اب جماعت کا کل بوجھ ان کے ہی کندھے پر آ پڑا۔

ادھر ملک میں مغل بادشاہ کی طاقت کم ہو رہی تھی اور انگریزوں کی طاقت بڑھ رہی تھی اور اس کے ساتھ اُن کا ظلم بھی بڑھ رہا تھا۔ انگریز گورنر جنرل لارڈ اسٹیر و برابر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ کسی انگریز کے سامنے سے کوئی ہندستانی گھوڑے پر سوار ہو کر نہیں نکل سکتا اس وقت کی غلامی کا یہ عالم تھا۔ عیسائیت کا بھی بہت زور تھا۔ دہلی کے تخت پر اس وقت بہادر شاہ ظفر تھے جو صرف نام کے ہی بہادر بادشاہ تھے۔ حکومت تو انگریز ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں تھی۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ لیکن حاجی امداد اللہ صاحب نے ہمت سے کام لیا۔ انھوں نے اپنی پارٹی کو مضبوط بنایا۔ بدقسمتی سے ولی اللٰہی جماعت میں بھی دو دل ہو چکے تھے۔ ایک دَل کے لیڈر مولانا ولایت علی صاحب صادق پوری تھے۔ انھیں یہ یقین تھا کہ سید احمد صاحب بریلوی بالاکوٹ کے میدان میں شہید نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ روپوش ہو گئے تھے۔ موقع پر وہ پھر ظاہر ہو کر دشمن کے ساتھ جنگ کریں گے۔ مگر خود انگریزوں کے مقابلے میں نہیں آ رہے تھے اور سید احمد صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔

اس وقت حاجی امداد اللہ صاحب کے خاص ساتھیوں میں مولانا عبدالغنی صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد گنگوہی تھے۔ ان کو ساتھ لے کر انھوں نے ملک میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا پرچار کیا اور دہلی کے مدرسہ سے برابر تعلق رکھا۔ اپنی پارٹی کو مضبوط بنایا۔ اس وقت لارڈ ڈلہوزی ہندستان کا گورنر جنرل تھا جو ہندوستانی ریاستوں کو ختم کرنے میں لگا ہوا تھا۔ حاجی صاحب اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ ملک میں انقلاب اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب ان کے ساتھ ملک کی عام جنتا ہو۔ اسلئے وہ عام جنتا کو اپنے ساتھ لانے میں لگے ہوئے تھے۔ حاجی امداد اللہ صاحب ایک

انقلابی ہونے کے ساتھ صوفی فقیر بھی تھے۔ انکی زبان میں جادو کا اثر تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ شروع ہوتے ہی ہزاروں مسلمان انکی فوج میں شریک ہو گئے۔ حاجی امداد اللہ صاحب نے شاملی کی جنگ میں انگریزوں کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔ اور لوگوں کے دلوں پر اپنی سپہ سالاری کا سکہ جما چکے تھے۔ انکے چاروں ساتھی مولانا عبد الغنی، مولانا محمد یعقوب، مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد برابر انکے ساتھ رہتے تھے۔ پشاور اور ہوتی مردان کی چھاؤنیوں میں رہنے والی کچھ پٹھان پلٹنوں نے جنگ آزادی میں شریک ہونے کی ضرور کوشش کی تھی، مگر وقت سے پہلے ہی انگریزوں کو انکی بغاوت کا پتہ چل گیا تھا لہذا انکے ہتھیار چھین لئے گئے اور بہتوں کو توپ دم کر دیا گیا۔

حاجی امداد اللہ کی پارٹیؒ کے خاص آدمی رشید احمد گنگوہی کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور انہیں پھانسی کا حکم بھی دیا جا چکا تھا۔ مگر پھانسی پر چڑھنے والوں میں انکا نمبر آخیر تھا۔ جب تک انکا نمبر پھانسی چڑھنے کا آیا تب تک شاہی اعلان کے مطابق عام معافی کا اعلان کیا جا چکا تھا لہذا وہ پھانسی سے بچ گئے۔ شاملی کی جنگ کے بعد ہی حاجی امداد اللہ۔ اپنے تین ساتھیوں کو لیکر مکہ چلے گئے تھے۔

اسکے بعد حاجی امداد اللہ ۱۸۹۷ء تک زندہ رہے اور مکہ سے ہی اپنے اُستاد شاہ محمد اسحاق کی طرح اپنی ہندوستانی انقلابی جماعت کو مدد پہنچاتے رہے۔ انکے مشہور شاگردوں میں مولانا حسین احمد مدنی بھی تھے جو ایک مشہور مجاہد جنگ آزادی تھے اور مدرسہ دیوبند کے صدر تھے۔ اِس طرح ۱۳۱۷ھ ہجری یعنی ۱۸۹۵ء کی کسی تاریخ کو ۸۴ سال کی عمر میں ہندوستان کے یہ بہت بڑے صوفی، بہت بڑے فقیر اور بہت بڑے وطن پرست انقلابی، بہت بڑے عالم اور ولی الٰہی جماعت کے جو تھے امام موت کی گود میں جا سوئے۔ انکے دل میں اپنے وطن کی ایک جھلک دیکھنے کی جو خواہش تھی وہ پوری نہ ہوئی مگر یہ تسلی ضرور تھی کہ انکی موت غلام ملک میں نہیں ہوئی تھی۔ کیسے کیسے عالم، صوفی

فقیر ہمارے وطن میں ہو چکے ہیں جنہوں نے اپنے وطن ہندوستان کی آزادی کے لیئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔

مشہور مجاہد جنگ آزادی

مولانا محمد قاسم

مولانا محمد قاسم انقلابی جماعت ولی اللہ کے پانچویں امام تھے۔ ان کی سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کی آزادی کی جنگ ناکامیاب ہو جانے کے بعد سرکاری جاسوس پھانسی کا پھندا لئے گلی گلی گھومتے پھرتے تھے وطن کے یہ غدار کچھ وطن پرستوں کو پھانسی دلا کر انگریزوں سے کچھ مراعات حاصل کرنے کے چکر میں گھوما کرتے تھے۔ آزادی کی لڑائی بھی ہم انھیں غداروں کی وجہ سے ہارے تھے ورنہ مٹھی بھر انگریز ہمارا کیا بگاڑ سکتے تھے۔

مولانا محمد قاسم کو خود پھانسی پانے کا خوف نہیں تھا مگر وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ولی اللہ کی وہ انقلابی جماعت جو ملک میں قریب ڈیڑھ سو سال سے وطن کی آزادی کے لئے کوشاں ہے اور جسکے لئے وطن پرستوں نے اپنا خون دیا ہے وہ آگے بھی زندہ رہ سکے۔ انھیں یہ بھی یقین تھا کہ کوئی ملک ہمیشہ غلام نہیں رہ سکتا ہے ایک دن ہندوستان بھی آزاد ہو کر رہیگا۔

مولانا محمد قاسم کے خیال میں حاجی امداد اللہ کا غدر سے پیشتر ہی مکہ چلا جانا مفید رہا، ورنہ وہ یہاں پھانسی سے نہیں بچ سکتے تھے۔ جنگ آزادی کی ناکامیابی کے بعد انقلابی جماعت کو زندہ رکھنا بڑی ٹیڑھی کھیر تھی قاسم صاحب کی حب الوطنی کی بھی پہچان تھی، جماعت کو زندہ رکھنا تھا۔ سب ہی ۱۸۵۷ء کی جنگ کے ہار جانے کے بعد ہمت ہار چکے تھے۔ مسلمان قوم بھی۔ بڑے بڑے لیڈر یہ سمجھا رہے تھے کہ مسلمانوں کو اپنی بقا کے لئے انگریزوں کا ساتھ دینا چاہئے اور انگریزوں کی حکومت ختم کرنا انکے لئے ناممکن ہے۔ ایسے بڑے انگریز دوست لیڈروں میں سر سید احمد خان

کا نام بھی بہت مشہور تھا۔ جو دراصل بکھری ہوئی قوم کو زیر تعلیم سے آراستہ کرنے کے حق تھے۔ وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی انگریزوں کی ملازمت کر رہے تھے۔ اپنی قوم کی بھلائی کا جو جذبہ سرسید احمد خاں کے دل میں تھا وہی جذبہ مولانا محمد قاسم کے دل میں تھا مگر انکے راستے جدا تھے۔ ایک انگریزوں کا خیر خواہ اور انگریزی تعلیم کا حامی تھا دوسرا انگریزوں اور انگریزی تہذیب سے متنفر تھا، مگر ملک میں انگریزیت کا پرچار زوروں سے ہو رہا تھا۔ اسکو روکنا ہی مولانا محمد قاسم کا خاص کام تھا۔ ولی الہیٰ کی انقلابی جماعت کو کیونکر زندہ رکھا جائے انھیں ہر دم یہ فکر ہی ستاتی رہتی تھی۔

اس وقت مکہ سے حاجی امداد اللہ نے کسی غیر مشہور جگہ پر ایک مدرسہ کھولنے کی اسکیم بھیجی تب اندھیرے میں تھوڑی روشنی نظر آئی۔ بس پھر کیا تھا مولانا محمد قاسم نے ۱۸۶۷ء میں سہارنپور سے ۴۲ میل دور ایک معمولی سی جگہ دیوبند میں ایک مذہبی اسکول دارالعلوم کے نام سے کھولا اور پھر یہی مدرسہ مستقبل میں انقلاب کا مرکز بن گیا۔ مدرسہ کھولنا آسان کام نہ تھا۔ مالی مشکلات تھیں، سرکاری خوف تھا۔ مگر مولانا رشید احمد گنگوہی نے برابر انکا ساتھ دیا۔ اسکے علاوہ مولانا مہتاب علی اور انکے بھائی مولانا ذوالفقار علی نے بھی اس کام میں پوری مدد کی اور اس کہاوت کے مطابق "ہمت مرداں مدد خدا" مدرسہ وجود میں آگیا۔

دیوبند مدرسہ کے پہلے طالب علم مولانا محمود الحسن تھے جو آگے چل کر مولانا کے سچے جانشین بنے۔ شروع میں درختوں کے زیر سایہ مدرسہ چلتا تھا۔ مکان کے نام پر ایک چھونپڑا تک نہیں تھا۔ اسکے بعد ہی مسلم لڑکوں کو انگریزی تعلیم دینے کے لئے علی گڈھ میں سرسید احمد خاں نے ایک کالج کھولا انھوں نے مولانا محمد قاسم کو بھی کالج میں ملازمت کی دعوت دی مگر مولانا نے صاف انکار کر دیا۔ محمد قاسم کو بہت بدنام کیا گیا اور انھیں انگریز دشمن یعنی باغی قرار دیا گیا۔ مولانا محمد قاسم چاہتے تھے کہ وہ اپنے مدرسہ کے ذریعہ مسلمانوں میں بیداری پھیلائیں اور قوم کو پھر ملک کی آزادی کے لئے

اسی طرح تیار کریں جس طرح ولی اللہ کی جماعت کر رہی تھی۔ تھوڑی ہی دنوں میں مدرسہ دارالعلوم کی بنیاد مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ دارالعلوم کو وطن پرست اُستاد معلم ملتے گئے مگر مدرسہ کو کامیاب دیکھنے کے لئے محمد قاسم زندہ نہ رہے وہ ۱۸۷۹ء میں انتقال کر گئے۔ مولانا محمد قاسم، نانوتہ، ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ انکے والد کا نام مولانا اسد علی تھا۔ انھوں نے حاجی امداد اللہ اور مفتی صدرالدین صاحب سے تعلیم حاصل کی تھی۔ مفتی صدرالدین اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے اور وہ دوسرے امام شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے۔

ولی الہٰی جماعت کے اماموں میں مولانا محمد قاسم کا نام اسلئے بھی اہم سمجھا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے ولی اللہ کی برباد شدہ جماعت کو پھر آباد کیا تھا اور اس طرح انکے انقلابی مدرسہ کو منہدم نہیں ہونے دیا اور اس حالت میں جب ملک میں انگریزوں کا ظلم کافی عروج پر تھا۔ ایک سچے انقلابی کی یہی تو پہچان ہے۔ اپنی وفات کے وقت تک یعنی (۱۸۷۹ء تک) انھوں نے ولی اللہ کی جماعت کو کافی مضبوط بنا دیا تھا۔

اب ضرورت اس بات کی تھی کہ جس درخت کو محمد قاسم نے اپنا خون دیکر سینچا ہے اب اُن کے بعد کون سینچے گا؟ تبھی سب کی نگاہ دیوبند مدرسہ کے پہلے طالب علم محمود الحسن پر پڑی مگر انکی عمر ابھی کم تھی اس لئے یہ کام حاجی رشید احمد گنگوہی کے سپرد کر دیا گیا تھا جو ایک بہت بڑے عالم تھے اور حدیث پر پوری دسترس رکھتے تھے۔

مشہور مجاہد جنگ آزادی

مولانا محمود الحسن

ولی اللہی جماعت کے چھٹے امام تھے مولانا محمود الحسن صاحب اس جماعت کی عنان انھوں نے ۱۹۰۵ء میں حاجی رشید احمد گنگوہی (جن کا ذکر پہلے آچکا ہے) کی وفات کے بعد سنبھالی تھی اس تحریک میں کام کرنا انھوں نے مولانا

محمد قاسم صاحب کے موجودگی میں ہی شروع کر دیا تھا۔ مولانا محمود الحسن صاحب کی پیدائش دیوبند ہی میں ۱۲۶۸ھ میں ہوئی تھی۔ ان کے والد مولانا ذوالفقار علی خاں اور ان کے ناؤ مولانا مہتاب علی صاحب ولی اللہی تحریک کے پرانے مددگار تھے اور ان کی مدد سے ہی مولانا محمد قاسم ۱۸۶۶ میں دیوبند کے مدرسہ کو قائم کر سکے تھے اور اس مدرسہ کے مولانا محمود الحسن پہلے طالب علم تھے۔ اور اپنی تعلیم پوری کرنے کے بعد اسی مکتب میں پہلے بلا تنخواہ تعلیم بھی دینے لگے تھے۔ بعد کو ۱۸۷۵ء میں وہ صرف ۲۵ روپیہ ماہوار تنخواہ لینے لگے تھے ۱۸۸۰ء میں ان کے استاد جب انتقال فرما گئے تو آپ کو بہت رنج ہوا کیونکہ مولانا محمد قاسم صاحب انھیں اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتے تھے

مولانا محمود الحسن نے دیوبند کے کچھ استادوں اور طلباء کو ملا کر "ثمرۃ الترتیب" نام کی ایک جماعت کی بنیاد بھی ڈالی تھی۔

خوش قسمتی سے ولی اللہی جماعت کے چوتھے امام حاجی امداد اللہ ابھی تک مکہ میں حیات تھے۔ مولانا حج کے بہانے اُن سے ملاقات کرنے کے لئے گئے۔ ان سے صلاح مشورہ کر کے وہ ہندستان واپس لوٹ آئے اس وقت ہندستان میں ایک نئی بیداری کی لہر پھیل رہی تھی آزادی کی ہلچل جو پہلے مسلمانوں تک محدود تھی اب ملک کے ہندوؤں تک جا پہنچی تھی۔ اور اس طرح اب دونوں قومیں وطن کی آزادی کی کوشش میں لگ گئی تھیں۔ انگریزوں کے لئے یہ ایک بُرا شگون تھا۔ یہ لارڈ لٹن کا زمانہ تھا۔ اس بدبخت وائسرائے کے زمانے میں ہی دکن میں وہ زبردست قحط پڑا تھا کہ جس میں ۵ لاکھ انسان مکھیوں کی طرح ختم ہو گئے تھے اسی وقت اس نے افغانستان پر حملہ کر دیا اور دہلی میں شاہی دربار بھی لگایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بغاوت کے لئے آمادہ ہو گئے۔

بغاوت کو دبانے کے لئے لارڈ لٹن نے کچھ معمولی حقوق تو دیئے مگر ہندستانیوں کے ہتھیار چھینے جانے لگے اور ساتھ ہی اس نے ملک کے ہندو مسلم کو لڑانے کی سازش بھی کی اس میں اُسے کامیابی ملی قوم کے جاہل لوگ ایک دوسرے کی گردنیں بھی ناپنے لگے۔

ان حالات میں بھی مولانا محمود الحسن اپنا کام کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ بغیر ہتھیاروں کے انگریزوں کے ساتھ لڑنا ممکن نہیں ہے لہٰذا اسلحہ جمع کرنا چاہئے اور یہ اسلحہ کابل کی خود مختار ریاست سے حاصل کئے جا سکتے ہیں ساتھ ہی سرحد پر بسے قبیلوں کی مدد بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس وقت ولی اللہی کی ایک شاخ سرحد میں قائم کی جا چکی تھی اور وہ ۱۸۳۷ء سے وہاں کام کر رہی تھی۔ قبیلوں کے کچھ لڑکے دیوبند میں تعلیم بھی حاصل کر رہے تھے۔ ان کے ذریعہ قبیلوں سے رابطہ قائم کرنا بھی آسان تھا۔ اس علاقے کے ایک با اثر سردار ترنگ زئی والے سے حاجی صاحب کی پرانی جان پہچان بھی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء کی آزادی کی لڑائی میں حاجی امداد اللہ صاحب آزاد قبیلوں کی مدد حاصل کرنے میں اور ولی اللہی جماعت کی ان دونوں شاخوں کو ملانے کی کوشش میں ناکامیاب رہے وہیں مولانا محمود الحسن کامیاب رہے افغانستان میں اس وقت امیر حبیب اللہ کی حکومت تھی۔ ان کے بھائی انگریزوں کے خلاف تھے۔ انہوں نے "جماعت سیاسیہ" کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ مولانا محمود الحسن نے اس جماعت سے رابطہ قائم کیا اور اس طرح ہندوستان اور افغانستان قریب آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی مولانا صاحب کو مولانا عبید اللہ سندھی و مولانا قاسم صاحب کے پوتے محمد میاں انصاری جیسے شاگردوں کی مدد بھی مل گئی تھی۔ مولانا کی سادگی۔ سچائی اور وطن پرستی کا ڈاکٹر مختار احمد انصاری پر یہ اثر ہوا کہ وہ بھی ان کے مرید بن گئے۔

۱۹۰۹ء کے قریب مولانا کی ہدایتوں کے مطابق ان کے شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی نے مدرسہ دیوبند میں جمعیت الانصار کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کی ۱۹۱۰ء کے دیوبند کے کنونیشن ہوا، اسی میں اس جماعت کا باقاعدہ اعلان کیا گیا تھا۔

جمعیت الانصار کا پہلا جلسہ ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ اپریل ۱۹۱۱ء کو مرادآباد میں ہوا ایک طرف مولانا اپنی طاقت مضبوط کرنے میں لگے ہوئے تھے تو دوسری طرف انگریز سرکار بھی ظلم پر کمر کس رہی تھی اور اس کے جاسوس برابر کام کر رہے تھے۔ اس زمانے میں دیوبند اسکول کے کچھ لڑکے علیگڑھ انگریزی پڑھنے

گئے تو علیگڈھ کے کچھ لڑکے دیوبند میں عربی پڑھنے بھی آئے ان میں ایک لڑکا انیس احمد جاسوس تھا۔ وہ مولانا کی تمام باتوں کی خبر اپنے آقاؤں (انگریزوں) کو دیتا رہتا تھا۔

کچھ دنوں بعد ترنگ زئی کے حاجی صاحب نے سرحد پر مدرسے قائم کئے تاکہ وہ بغاوت کا پرچار کرسکیں۔ اس وقت انھیں اپنے پراونس کے جوشیلے نوجوان کی مدد بھی حاصل ہو گئی۔ اس نوجوان کا نام خان عبدالغفار خان تھا اور جو بعد کو فرنٹیر گاندھی سرحدی گاندھی کے نام سے مشہور ہوگئے سرکار نے فوراً سرحد کے ان مدرسوں کو بند کرادیا۔ جبکہ مولانا محمود الحسن یہ چاہتے تھے کہ افغانستان سے لے کر ہندستان کے مشرقی کنارے تک انقلابی تحریک کا پرچار کیا جائے

کچھ دنوں کے بعد جب ترکی اور بلقان کے درمیان جنگ چھڑی تو مولانا نے ترکی کے مسلمانوں کی مدد کرنیکا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر انصاری خود اپنا ڈاکٹری مشن لیکر ترکی گئے۔ جب ۱۹۱۴ء میں عالمی جنگ چھڑی تو مولانا نے کہا کہ ملک کے لئے آزادی حاصل کرنیکا یہ ایک سنہرا موقع ہے اور پھر اسی کوشش میں لگ گئے۔ اس وقت ہندوستان کے ایک انگریز پرست مولوی عبدالحق حقانی نے یہ فتویٰ نکالا کہ ترکی اور انگریزوں کی لڑائی میں مسلمانوں کو انگریز کا ساتھ دینا اور مدد کرنا چاہئے۔ جب یہ فتویٰ مولانا محمود الحسن کے پاس دستخط کے لئے لے جایا گیا تو دستخط تو کجا۔ انھوں نے اسے دور پھینک دیا۔ اسوقت انھوں نے جو ہمت کا کام کیا تھا وہ داد کے قابل تھا۔

۱۹۱۵ء میں مولانا صاحب نے مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل بھیجا جہاں جنرل قادر خاں سے ملے کہتے ہیں افغانستان میں امیر حبیب اللہ کو تخت سے اتار کر ان کے بھائی امان اللہ کو بٹھانے میں مولانا کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

امان اللہ انگریزوں کے خلاف تھے اور کچھ دنوں بعد انگریزوں نے انھیں تخت سے اتار دیا تھا ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ کو مولانا اپنے کچھ چنے ہوئے ساتھیوں کو لے کر حج کے لئے روانہ ہو گئے۔ انگریزوں کا جاسوس انیس احمد غدار مولانا کی تمام سرگرمیوں کی خبر انگریزوں کو پہنچا رہا تھا۔ پھر بھی وہ مکہ شریف پہنچ ہی گئے، راستے میں جگہ جگہ ان کا شاندار استقبال کیا گیا تھا۔

جہاز پہونچے کہ مولانا محمود الحسن صاحب حجاز کے گورنر غالب پاشا سے ملے اور ان سے سرحدی قبیلوں کے لئے ایک خط حاصل کیا کہ وہ لوگ انگریزوں کے خلاف مجاہدوں کی مدد کریں۔

مدینے میں مولانا نے ترکی حکومت کے وزیر جنگ انور پاشا اور ایک دوسرے فوجی افسر جمال پاشا سے ملاقات کی انہوں نے مولانا کو پوری مدد دینے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ اصلی مدد تو آپ کے ملک والے ہی دے سکتے ہیں آپ کو اپنے ملک کے ہندوؤں کی مدد بھی لینا چاہئے۔ انہوں نے کابل کے اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ ہندوؤں کو اپنے ساتھ لیں اور انھیں ذمہ داری کے کام دیں اس مشورہ کے مطابق کابل میں ہندوستان کی عارضی حکومت کی بنیاد رکھی گئی اور راجہ مہندر پرتاپ کو اس حکومت کا صدر بنایا گیا اور مولوی برکت اللہ کو وزیر اعلیٰ بنایا گیا تھا۔

اس وقت انور پاشا کی صلاح سے یہ بھی طے ہوا تھا کہ مولوی محمود الحسن خود بھی آزاد قبیلوں میں پہنچیں۔ ابھی یہ انتظام ہو ہی رہا تھا کہ مکہ کا حاکم شریف حسین اپنی شرافت چھوڑ کر انگریزوں سے مل گیا۔ اس نے ترکی حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ مولانا، اس کا نتیجہ جانتے تھے۔ انھوں نے مکہ سے باہر نکلنے کی کوشش بھی کی مگر ناکام رہے

۱۹۱۶ء ۱۷ستمبر کو گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے بعد ۴ سال تک وہ مالٹا کی فوجی جیل میں نظر بند رہے۔ اور انھیں وہاں بہت تکلیف دی گئی ان کے ایک ساتھی حکیم نصرت حسین صاحب کا وہیں انتقال ہو گیا۔

مئی ۱۹۲۰ء کے آخری ہفتے میں نظر بندی سے رہا ہو کر مولوی صاحب اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بمبئی کے ساحل پر پہونچے اس وقت تک خلافت کی تحریک شروع ہو چکی تھی مسلمان ترکی کے مظلوم بھائیوں کی امداد کر رہے تھے۔ بمبئی کے ساحل پر جہاز لگنے سے قبل ہی پولس کے کچھ افسروں اور ایک مولوی رحیم بخش نے مولانا کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے کسی استقبالیہ جلسے میں شریک نہ ہو کر سیدھے دیوبند چلے جائیں اور خلافت میں کوئی حصہ نہ لیں۔ مگر دیوبند تک خلافتیوں نے ہر اسٹیشن پر ان کا زوردار استقبال کیا۔

دیوبند پہونچ کر اس مرد مجاہد نے اپنے ساتھیوں کے سامنے انگریزوں کے خلاف لڑنے کا پروگرام رکھ دیا۔ لیکن چار سال کی نظر بندی نے ان کی صحت چوپٹ کر دی تھی۔ ایسی حالت میں وہ علیگڈھ کے طلباء کے اصرار پر ایک جلسے کی صدارت کرنے گئے تھے۔ یہ تاریخ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء تھی اور یہ ان کی آخری پرجوش تقریر تھی۔ انھوں نے وہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد رکھا جو آج بھی دیوبند سندھ کی طرح کام کر رہا ہے۔ اس کے ٹھیک ایک ماہ بعد دلّی میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر مرد مجاہد مولانا محمود الحسن کا انتقال ہوا۔

مشہور مجاہد جنگ آزادی

مولانا عبید اللہؒ سندھی

مولانا عبید اللہؒ سندھی کا جنم ۱۰ر مارچ ۱۸۷۲ء کو سیالکوٹ (پنجاب) میں ایک ہندو سکھ خاندان میں ہوا تھا۔ ان کے والد کا نام رام سنگھ تھا۔ جو سنار تھے اور بیٹے کے جنم سے چار مہینہ پہلے ہی انتقال کر چکے تھے بیٹے نے تعلیم پانے کے بعد اسلام دھرم قبول کر لیا تھا۔ آپ کی شادی سکھر اسلامیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی لڑکی کے ساتھ کر دی گئی تھی اُن کی والدہ نے اسلام مذہب قبول نہیں کیا پھر بھی وہ اپنے بیٹے کے ساتھ رہیں۔

جناب عبید اللہ سندھی مولانا محمود الحسن سے بھی ملے اور دیوبند بھی آتے جاتے رہے اور انہوں نے دہلی میں ایک انقلابی پارٹی بنائی۔ اس زمانہ میں ہندستان کے مختلف حصّوں میں انقلابی پارٹیاں کام کر رہی تھی۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے ان کے ساتھ بھی رابطہ قائم کیا۔ اس بات کا ذکر مشہور انقلابی سچندر ناتھ سانیال کی کتاب "ہندی جیون" میں بھی ملتا ہے۔ اسی دوران یورپ میں پہلی عالمی جنگ شروع ہو گئی تو مولانا محمود الحسن نے ان کا فائدہ اٹھانا چاہا۔ انہوں نے مولانا عبید اللہ کو کابل بھیجا، کابل میں عبید اللہؒ کو بڑی بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں، شروع میں کابل سرکار نے انھیں گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ یہاں کی جیل میں کچھ دیگر ہندستانی بھی قید تھے، جو انقلاب کے مقصد سے ہی کابل گئے ہوئے تھے۔

جرمن ترکش مشن کیساتھ راجہ مہندر پرتاپ کابل تشریف لائے تو تمام دیگر ہندوستانیوں کے ساتھ عبید اللہ کو بھی رہا کر دیا گیا۔ اب وہ جنرل قادر خاں سے ملے جو مولانا محمود الحسن کو جانتے تھے انہوں نے سب طرح کی مدد دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد ہی کابل میں عارضی آزاد ہند سرکار بنائی گئی تھی جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ اور وزیر اعلیٰ مولانا برکت اللہ تھے۔ مولانا عبید اللہ کو ہوم منسٹر کا عہدہ دیا گیا۔ کابل میں جو فوج انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے تیار کی گئی اسکے جنرل بھی مولانا عبید اللہ ہی تھے۔

ہندوستان میں بھی خدائی خدمت گار نام کی ایک فوج تیار کی گئی جس کے کمانڈر مولانا محمود الحسن صاحب تھے۔ مگر وہ اس وقت مکہ میں تھے مولانا عبید اللہ سندھی ہندوستان کی خبریں ان کو بھیج دیا کرتے تھے۔

انہوں نے پہلے ریشم پر ان کے لئے ایک خط لکھوایا۔ یہ خط کاغذ پر پھولوں کی شکل میں لکھا گیا تھا۔ وہ خط ایک طالبعلم عبد الحق کو دیا گیا۔ اسے وہ خط عبد الرحیم کو پہونچانا تھا اور عبد الرحیم بعد کو اسے مولانا محمود الحسن کو پہونچادیتے لیکن عبد الحق نے وہ خط خان بہادر حق نواز خان کو دیدیا۔ جنہوں نے وہ خط سرکار تک پہونچادیا اور سازش کا پتہ انگریزوں کو مل گیا۔

محمود الحسن صاحب کو مکہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ شیخ عبد الرحیم کے خلاف وارنٹ نکلا۔ لیکن وہ فرار ہو گئے۔ کابل کے امیر حبیب اللہ پر یہ زور ڈالا گیا کہ وہ مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے تمام ساتھیوں کو انگریزوں کے حوالے کر دیں۔ وہ انگریزوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ لیکن امیر حبیب اللہ کے چھوٹے بھائی نصرت اللہ خاں اور امیر کے بیٹے امان اللہ خاں وغیرہ انگریزوں کے خلاف تھے۔ ان لوگوں نے امیر کو ایسا تو نہ کرنے دیا مگر پھر بھی مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل کی جیل میں بند کر دیا گیا۔ وہ جیل میں بھی خاموش نہیں رہے اور انگریزوں کے خلاف پارٹی کو مدد کرتے رہے۔

۱۹، فروری ۱۹۱۹ء کو باغیوں نے امیر حبیب اللہ کو قتل کر دیا اور ان کے لڑکے امان اللہ خان کابل کے تخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ انہوں نے اب مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ساتھیوں کو جیل سے رہا کر دیا۔ وہ مولانا عبید اللہ

سے حکومت کے کاموں میں مشورہ لینے لگے۔ ان کے صلاح مان کر افغانستان نے انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا۔ انگریز عالمی جنگ جیت کر بھی بہت کمزور ہو چکے تھے۔ اور ہندستان میں "رولٹ بل" کی وجہ سے فضا انگریزوں کے خلاف تھی۔ یہ موقع غلامی سے نکلنے کا تھا۔

لڑائی کا اعلان ہوتے ہی سرحد کے آزاد قبیلے بھی مولانا عبیداللہ کے ایک دوسرے ساتھی ترنگ زئی کے حاجی صاحب کی رہنمائی میں۔ انگریزوں کے خلاف کمربستہ ہو گئے۔ لڑائی صرف ۲۴ جولائی ۱۹۱۹ء تک چلی اس کے بعد انگریزوں نے افغانستان سے صلح کرلی اور اسکو بالکل آزاد کر دیا۔ صلح کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ کابل سرکار اب مولانا عبیداللہ سندھی پنے ملک میں کوئی سیاسی تحریک نہ چلانے دے گی مولانا عبیداللہ نے اب کابل ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا مگر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ایک شاخ انھوں نے کابل میں کھلوادی تھی۔

اس کے بعد مولانا عبیداللہ روس گئے اور وہاں سات ماہ تک رہے کمیونزم کے اصولوں کی جانکاری حاصل کی مگر کمیونسٹ پارٹی میں شریک نہ ہوئے جو خدا کی منکر تھی۔ اس کے بعد مولانا ترکی گئے اور وہاں قریب تین سال تک رہے۔ اسی دوران لالہ لاجپت رائے اور ڈاکٹر انصاری بھی ترکستان تشریف لے گئے۔ ان سے ملاقات کرنے۔ پنڈت جواہرلال بھی اٹلی میں جاکر ان سے ملے اور بات چیت کی۔ پنڈت جی نے عدم تشدد پر زور دیا۔ اس کے بعد کئی ملکوں کی خاک چھانی اور انھیں تو اپنے وطن کو آزاد دیکھنے کی تڑپ تھی وہ مکہ گئے اور وہاں خلافت کانفرنس میں حصہ لینا چاہتے تھے جو ان کے وہاں پہونچنے کے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ ہندوستان کے تمام نمائندے واپس جا چکے تھے اب تمام حالات پر غور کر کے انھوں نے مکہ میں ہی رہنا مناسب سمجھا۔ وہ وہاں ایک مدرسہ میں تعلیم دینے لگے اور ۲۴ سال کی جلاوطنی کے بعد مولانا عبیداللہ اپنے وطن واپس آگئے اپنے پرانے ساتھیوں سے ملنے کے بعد وہ دہلی گئے اور وہاں شاہ ولی اللہ کے اصولوں کا پرچار کرنا شروع کیا۔ اس طرح ملک کی خدمت وہ آخر وقت تک کرتے رہے۔ اس مشہور مجاہد جنگ آزادی کا انتقال ۲۱ اگست ۱۹۴۴ء کو دین پور (بھاولپور) میں ہوا۔ آخری وقت تک

وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی رہے۔ وہ انسان دوست تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی ملک کی آزادی حاصل کرنے میں صرف کر دی۔ مگر بدقسمتی کہ وہ ملک کو آزاد نہ دیکھ سکے اور آزادی ملنے کے صرف تین سال قبل راہی ملک عدم ہو گئے۔ ایسے سچے محب وطن اور مجاہدوں سے ہماری آزادی کی تاریخ درخشاں ہے۔

> "میں ہندوستانی مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ جب تک تم ہندوستانی نہ ہو گے نہ تمہاری اپنے ملک میں عزت ہو گی اور نہ اسلامی ملکوں میں تمہیں احترام کی نظر سے دیکھا جائیگا" (عبید اللہ سندھی)

مشہور مجاہد جنگ آزادی

حاجی فضل واحد

حاجی فضل واحد صاحب دراصل ولی اللٰہی تحریک کے ہی لیڈر تھے ان کی پیری مریدی کا سلسلہ ولی اللٰہی جماعت کی اس شاخ سے تھا جو ۱۸۲۴ء میں سید احمد بریلوی کی لیڈری میں انگریزوں کے دوست سکھوں سے لڑنے کے لئے سرحد پر چلی گئی تھی۔ سید احمد صاحب کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں نے ان کے کام کو جاری رکھا اور جب ۱۸۴۹ء میں سرحد کا یہ علاقہ انگریزوں کی حکومت میں آگیا تو 'ستیانا' نام کے پہاڑی مقام پر انہوں نے چھاؤنی بنا کر انگریزوں کے ساتھ لڑنا شروع کیا۔ ۱۸۵۸ء میں انگریزوں نے جب اس چھاؤنی کو برباد کر دیا تو وہاں کے لوگ پیشاور سے شمال مغرب کی طرف کے گاؤں میں جا کر رہنے لگے۔ ان گاؤں پر بھی انگریزوں نے ایک بڑی فوج لے کر ۱۸۶۳ء میں حملہ کر دیا اور علاقہ کو برباد کر دیا۔ اب

یہ لوگ ادھر ادھر بکھر گئے اور الگ الگ قبیلوں میں رہ کر انگریزوں سے لڑنا شروع کیا۔ ان ہی لوگوں میں ایک تھے مولانا نجم الدین صاحب جسکو سرحد کی تاریخ میں ملا ہڈا کے نام سے ذکر آیا ہے اور جنہوں نے انگریزوں کو بجہ چین کی نیند نہ سونے دیا۔ حاجی فضل واحد صاحب انہیں ملا ہڈا کے شاگرد تھے اور بعد کو خلیفہ بنے اور انگریزوں کے دشمن خاص تھے۔ اس وقت حاجی فضل واحد صاحب اپنے تمام خاندان کے ساتھ ترنگ زئی میں رہتے تھے۔ ترنگ زئی ضلع پشاور رچرسدا تحصیل میں ہے۔ یہ گاؤں خان عبدالغفار خاں (سرحدی گاندھی) کے گاؤں سے قریب ہے۔ ترنگ زئی کہا گیا۔

حاجی صاحب کا یہ خیال تھا کہ ہمیں انگریزوں کے ساتھ پوری تیاری کے ساتھ لڑنا چاہئیے، ہمیں غیر پٹھانوں میں بھی آزادی کا جوش پیدا کرنا چاہئیے انہوں نے پٹھانوں کی آزادی کے سوال کو کل ہندوستان کی آزادی کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ انھوں نے پہلے ۱۹۰۹ء میں ولی اللہی پارٹی کے چھٹے امام مولانا محمود الحسن سے رابطہ قائم کر لیا تھا اور ایسے رابطے کو مولانا محمود الحسن پہلے ہی سے چاہتے تھے۔ خان عبدالغفار خان خود ان حاجی صاحب کو اپنا پیشوا مانتے تھے۔ لوگوں کو آزادی کی تعلیم دینے کے لئے حاجی فضل واحد صاحب نے بہت سے اسکول قائم کئے لیکن انگریزوں نے ان اسکولوں کو بند کرا دیا۔ انگریز تو حاجی صاحب کو گرفتار کر لینا چاہتے تھے مگر حاجی صاحب عوام میں بے حد مقبول تھے اس لئے بغاوت ہو جانے کے خوف سے انھیں گرفتار نہ کیا۔

کچھ دنوں بعد جب ۱۹۱۴ء میں یورپ میں جنگ شروع ہو گئی تو مولانا محمود الحسن نے حاجی صاحب کو یہ پیغام بھیجا کہ اب ہمیں انگریزوں کے خلاف لڑائی شروع کر دینی ہے یہ پیغام پاتے ہی حاجی صاحب برٹش علاقے سے نکل کر قبائلی علاقے میں چلے گئے اور ۲ جون ۱۹۱۴ء کو انگریزوں کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا قبائلی فوجوں نے پہلا حملہ برٹش علاقے پر ۱۷ اگست ۱۹۱۴ء کو کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ دوسرے حملے انگریزی چوکیوں پر کئے گئے اور وہاں سے انگریزوں کو بھگایا گیا۔ مگر انگریزوں نے

پھر قبضہ کر لیا۔ اب حاجی صاحب اس نتیجے پر پہونچے کہ جب تک ہمارے پاس کافی تعداد میں اچھے اسلحہ نہ ہوں اور ہماری فوجوں کو لڑائی کی ٹھیک ٹریننگ نہ دی گئی ہو کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔

حاجی صاحب نے مولانا محمود الحسن صاحب کو لکھا۔ اس پر مولانا نے اپنے شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی کو ان کے پاس بھیجا۔ اور وہ خود مکہ چلے گئے اسی درمیان غدار مولانا سیف الرحمان وغیرہ انگریزوں سے جا ملے۔ لیکن حاجی صاحب پکڑے نہ جا سکے۔ اُدھر عالمی جنگ ختم ہوتے ہی ہندوستان میں رولٹ ایکٹ لگا دیا گیا اور ادھر امیر امان اللہ صاحب نے ہندوستان پر چڑھائی کر دی۔ اس میں حاجی صاحب کا بھی ہاتھ تھا۔ یہ طے تھا کہ ہندوستان سے انگریزوں کو بھگا کر ہندوستانی عوام کابل کی مدد کریں گے۔ بدلے میں کابل ہندوستان کی آزادی کو منظور کرے گا۔ اسی وجہ سے حاجی صاحب نے اس لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد کابل سرکار اور برٹش سرکار میں صلح ہو گئی انگریزوں نے کابل کو مکمل آزادی دے دی اور ہندوستان غلام ہی بنا رہا۔ لیکن حاجی صاحب اب بھی انگریزوں کے خلاف تھے۔

۲۱-۱۹۲۰ء میں تمام ہندوستان کی طرح سرحد میں بھی عدم تشدد کی تحریک نے زور پکڑا۔ اس تحریک کی رہنمائی حاجی صاحب کے پرانے ساتھی خان عبد الغفار خاںؒ کی اسی درمیان مولانا محمود الحسن صاحب مالٹا کی نظر بندی سے رہا ہو کر ہندوستان واپس آئے۔ اور اس تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ انھوں نے پشتو زبان کا ایک اخبار نکالا جو پشتو زبان کا پہلا اخبار تھا اور جس کا ہندی نام چنگاری تھا۔ اس اخبار نے ہندو مسلم اتحاد کا اچھا کام کیا۔ جب انگریزوں نے خدائی خدمت گاروں پر ظلم کیا تو حاجی صاحب نے پشاور پر حملہ کر دیا۔ اس سے انگریز بہت پریشان ہوئے گویا حاجی صاحب زندگی بھر انگریزوں سے لڑتے ہی رہے ۱۹۳۰ء کے بعد مرد مجاہد حاجی فضل واحد کا انتقال ہو گیا۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے تلوار لڑنے والے ایک سورما نے اب ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ حاجی صاحب کی قربانیوں کو ہندوستانیوں نے فراموش کر دیا ہے۔

مشہور مجاہد جنگ آزادی

مولانا فضل الحق خیر آبادی

مولانا فضل الحق ایک بڑے عالم اور رئیس شخص تھے۔ آپ کے بزرگ کبھی ایران سے آکر خیر آباد ضلع سیتاپور (ہندوستان) میں بس گئے تھے مولانا کا جنم خیر آباد میں ۱۷۹۰ میں ہوا تھا۔ ان کی پرورش دہلی میں ہوئی ان کے والد شاہی دربار میں پالکی پر سوار ہو کر جاتے اور فضل الحق کو اپنے ساتھ لیجاتے۔ پالکی کے اندر وہ اپنے لڑکے کو پڑھاتے بھی تھے۔ بڑے ہونے پر ان کو شاہ عبد العزیز کے پاس بھیجا گیا۔ تعلیم پوری ہو جانے پر وہ شاہ صاحب کے مدرسے میں پڑھانے بھی لگے۔ کچھ اور بڑے ہونے پر وہ انگریز ریزیڈنٹ کی عدالت میں سرشتہ دار ہو گئے۔ بادشاہ اکبر شاہ اور ریزیڈنٹ دونوں مولانا کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سرکاری نوکری ہو جانے پر بھی پڑھانے کا کام کرتے رہے وہ عربی کے شاعر تھے شطرنج کھیلنے کے شوقین تھے۔

کچھ دنوں کے بعد جب دہلی دربار میں دوسرا ریزیڈنٹ آیا تو مولانا کو ناظم بنا دیا۔ اس کے ولایت چلے جانے پر مولانا صاحب مفتی بنائے گئے لیکن اس کے بعد مولانا کو انگریز افسروں سے نہیں بنی کیونکہ انگریز اپنے کو برتر سمجھتے تھے مولانا نے غلامی کا احساس کیا۔ نوکری چھوڑ دی اب مولانا کو سرکاری وکیل بنا کر الہ آباد بھیجا گیا۔ اس زمانے میں بہادر شاہ ظفر ولی عہد تھے۔ لیکن مولانا خود دار تھے وکالت سے بھی الگ ہو گئے اس خبر کو سن کر جھجر کے رئیس فیض محمد نے مولانا کو پانچ سو روپیہ ماہوار پہ اپنے یہاں بلا لیا۔

کچھ عرصے بعد مولانا ریاست الور چلے گئے وہاں بھی جب دل نہ لگا تو سہارنپور گئے اور اس کے بعد ٹونک ریاست کے نواب وزیر الدولہ کے یہاں کچھ دن رہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا فضل الحق اتنی ریاستوں میں انھیں بغاوت کے لئے تیار کرنے کے لئے گئے تھے۔ لکھنؤ

میں اس وقت نواب واجد علی شاہ کی حکومت تھی۔ کچھ دن مولانا صاحب وہاں رہے مگر نواب صاحب کی عیش پرستی کو دیکھ کر وہ بدظن ہو گئے اور وہاں سے چلے آئے ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی رام پور کی گدّی پر بیٹھے تو انھوں نے اپنے دوست مرزا غالب کو وہاں نوکر رکھا دیا۔ ۱۸۵۷ء کو جب غدر شروع ہوئی تو دلّی کے بادشاہ کی طرف سے نواب صاحب کے پاس وہ آئے۔ مولانا نے نواب صاحب کو دہلی کے بادشاہ کا ساتھ دینے کا مشورہ دیا مگر نواب صاحب راضی نہ ہوئے مولانا کے دل میں وطن کی آزادی کی تڑپ تھی اس لیے وہ خاموش نہ بیٹھ سکے اور خود بغاوت کے لیے آمادہ ہو گئے کچھ دن کے بعد جب مولانا صاحب کو معلوم ہوا کہ دلّی پھر آزاد ہو گیا ہے اور بہادر شاہ ظفر حکومت چلا رہے ہیں تو وہ فوراً دہلی پہنچے لیکن دہلی کی حالت دیکھ کر مولانا کو بہت تکلیف ہوئی۔ دہلی کے غنڈے لوٹ کھسوٹ میں لگے ہوئے تھے اور شاہزادے سب نکمّے تھے۔

دلّی میں ایک جماعت جس پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا ولی اللّٰہی کی تھی اس جماعت کے لوگ مولانا سے ملتے رہتے تھے۔ روہیلوں کی فوج کا جنرل بخت خاں مولانا کی مدد پر تھا۔ مرزا الٰہی بخش انگریزوں سے ملا ہوا تھا وہ غدّار تھا۔ آخر بخت خان کے کہنے پر مولانا فضل الحق نے جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد ایک پر زور باغیانہ تقریر کی اور فتویٰ دیا کہ آزادی کی جنگ میں شریک ہونا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اس فتوے کا اثر یہ ہوا کہ قریب نوے ہزار آزادی کے سپاہی بادشاہ کے جھنڈے تلے آ گئے۔ دربار میں اب بھی دغاباز اور غدّار مرزا الٰہی بخش کی ہی بات سنی جاتی تھی۔ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو کمپنی کی فوج نے پھر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ مولانا صاحب کے ارمان مٹی میں مل گئے۔

جامع مسجد میں فتویٰ دینے کی خبر مخبروں نے انگریز سرکار تک پہونچا دی اور مولانا کی تلاش ہونے لگی۔

۲۴ ستمبر ۵۷ء کو مولانا صاحب اپنے خاندان کو لے کر چپ چاپ دہلی سے نکل آئے۔ انھوں نے بھیکم پور علیگڈھ کے نواب کے یہاں پناہ لی لیکن ۱۰ دن تک رُکنے کے بعد انھیں وہاں سے بھی جانا پڑا مولانا قریب

دو سال تک خانہ بدوشی کی حالت میں مارے مارے پھرتے رہے جب رانی وکٹوریہ کا عام معافی کا اعلان ہوا تو مولانا صاحب ظاہر ہو گئے اور اور اپنے گھر خیرآباد جا کر رہنے لگے۔

لیکن مولانا فضل الحق تو سرکار کی اس فہرست میں تھے جن کو عام معافی میں بھی معاف نہیں کیا گیا تھا۔ مولانا کو گرفتار کر لیا گیا۔ لکھنؤ کی فوجی عدالت میں ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا اور انہوں نے خود ہی اپنے کیس کی پیروی کی۔ جج ان کے شاگردوں میں سے تھا۔ مخبر پر بھی کچھ ایسا اثر پڑا کہ اس نے کہہ دیا کہ دہلی کی جامع مسجد میں فتویٰ دینے والا کوئی دوسرا مولوی تھا۔ مگر فضل الحق نے جھوٹ نہیں بولا اور کہہ دیا کہ فتویٰ انہوں نے ہی دیا تھا۔ اس پر عدالت نے مجبوراً ان کو کالے پانی کا سزا سنائی۔ انڈمان میں انہیں بہت تکلیف دی گئی، انہوں نے یہاں ایک کتاب "ثورۃ ہندیہ" لکھی جو وہاں کی تکالیف کا آئینہ ہے۔

انڈمان میں ہی مولانا کا انتقال ۱۸۶۱ء میں ہو گیا اور وہ شہیدوں کی جماعت میں مل گئے۔

مشہور مجاہد جنگ آزادی

مولانا مظہر الحق

مولانا مظہر الحق ہندو مسلم یکجہتی کے علم بردار تھے اور محب وطن تھے وہ خود ایک امیر آدمی تھے مگر امیری کی بو ان کو چھو تک نہیں گئی تھی وہ تو ایک فقیر جیسی زندگی گذارتے تھے وہ اپنے قوم کے فقیر تھے۔ مولانا مظہر الحق لندن میں گاندھی جی کے ساتھ بیرسٹری پڑھتے تھے۔ گاندھی جی تو بیرسٹری کرنے کے کچھ دن بعد جنوبی امریکہ چلے گئے تھے مگر مظہر الحق ہندوستان آ گئے ادھر ہندوستان میں بیداری آ چکی تھی اور ہندوستانی عوام انگریز حکومت سے آزادی کے کچھ حقوق پانے کی جد و جہد میں لگے ہوئے تھے اس جد و جہد کو

شانتی کرنے کے لئے برٹش سرکار نے منٹو ریفارم کا تحفہ ہندوستانیوں کو دیا جسے پاکر ہندو اور مسلمان کبھی امن سے رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ تو ان دونوں جماعت میں پھوٹ ڈالنے کی ہی کوشش کر رہے تھے۔ کسی الیکشن میں ووٹ دینے کے لئے جو قابلیت ہونا چاہئے وہ ہندوستانی ہندو مسلم کے لئے الگ الگ تھی۔ اس طرح سے یہ ریفارم میل جول نہیں پھوٹ ہی پیدا کرنے والے تھے۔ وطن پرست مظہر الحق نے اس کی سخت مخالفت کی اور ریفارم کو ہندو مسلم پھوٹ ڈالنے کا دستاویز بتایا۔ سبھی جماعت کے لوگوں نے جب ان سے رفارموں کی مخالفت کی تو پھر وہ جاری نہ ہو سکے اس کے بعد کانگریس کی مانگوں سے انگلینڈ کی پبلک کو روشناس کرانے کے لئے ہندوستان سے جو وفد انگلینڈ بھیجا گیا اس میں مولانا بیرسٹر مظہر الحق بھی شامل تھے اصل منشاء تو انگریزوں کا ہندوستان پر اپنا شکنجہ اور مضبوطی کے ساتھ کسنے کا تھا۔ اس وفد میں مسٹر محمد علی جناح۔ لالہ لاجپت رائے اور سچدانند سنہا جیسے ہندوستانی لیڈر شامل تھے۔ لیکن یہ ڈیلیگیشن بھی خالی ہاتھ لوٹ آیا ۱۹۱۵ء میں مہاتما گاندھی امریکہ سے واپس آگئے اور چپارن گئے تو چپارن کے ستیہ گرہ کی لڑائی میں مولانا مظہر الحق نے بڑی مدد پہونچائی۔ چپارن میں۔ گورے کالوں پر بڑی زیادتیاں کر رہے تھے۔ ان کی جانچ کرنے کے لئے ہی گاندھی جی وہاں گئے تھے۔ گاندھی جی نے جب لوگوں سے معلوم کیا کہ تم میں جیل جانے کے لئے کون کون تیار ہے تو جیل جانے والوں میں پہلا ہاتھ مولانا مظہر الحق صاحب کا تھا۔ گاندھی جی نے پہلی ٹولی کا صدر مولانا ہی کو بنایا تھا۔ ۱۹۱۷ء صوبہ بہار میں جگہ جگہ گائے کی قربانی کو لیکر جھگڑے ہوئے اور ان تمام جھگڑوں میں مسلمان ہی زیادہ نقصان میں رہتے تھے کیونکہ ہندو اکثریت میں تھے مگر مظہر الحق صاحب نے ہر مظلوم کی مدد کی اور یہ نہیں دیکھا کہ وہ مظلوم ہندو ہے یا مسلمان ہے ۱۹۲۰-۲۱ء میں گاندھی جی نے جب عدم تشدد کی کی تحریک شروع کی اور لوگوں سے اپیل کی کہ وہ سرکاری نوکریاں چھوڑ دیں سرکاری اسکول کالج بند کر دیئے جائیں تو مولانا مظہر الحق نے اپنی اچھی خاصی بیرسٹری کو چھوڑ دیا تھا۔ ملک کے لئے ان کی یہ بڑی قربانی تھی

جن طلباء نے اسکول چھوڑے ان کی مدد بھی مولانا نے کی تھی ان کے لئے انھوں نے کچھ مکان تعمیر کرائے تھے جو صداقت آشرم کے نام سے آج بھی مشہور ہیں۔ بعد کو پٹنہ کا صداقت آشرم کانگریس کا مرکز بن گیا تھا مولانا تو سچے کانگریس مین تھے ان میں مذہبی تعصب کی بو تک نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے ایک بہت چہیتے مسلمان لڑکے کو اس قصور کی بنا پر اپنے گھر سے نکال دیا تھا کہ اس نے ایک ہندو لڑکے کو مسلمان بنانے کے لئے کوشش کی تھی۔ مولانا مظہرالحق بہت دنوں تک بہار ودیاپیٹھ کے چانسلر رہے تھے اور وہ چھپرا ضلع بورڈ کے چیرمین بھی بنائے گئے تھے۔ مگر گوبالی ٹانگریس کی صدارت انھوں نے قبول نہ کی یہ ان کی خاکساری تھی۔ مولانا مظہرالحق وہ پاک ہستی تھے جو فرقہ پرستی سے ہمیشہ دور اور وطن پرستی کے لئے ہمیشہ آمادہ رہے۔ اس سچے انسان دوست کو کچھ تنگ نظر مسلمانوں نے کافر تک کہہ ڈالا مگر مولانا پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوا

۱۹۲۹ء میں جب کانگریس کا سالانہ اجلاس پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں لاہور میں ہو رہا تھا اور مکمل آزادی کی تجویز پاس کی جارہی تھی اس وقت فرید پور ضلع چھپرا (بہار) میں ان کا انتقال ہو گیا۔ وطن دوست کی موت کا صدمہ سبھی وطن دوستوں کو صدمہ دے گیا۔ اور سب نے محسوس کیا کہ وطن نے آج ایک وطن دوست کو کھو دیا ہے۔ آج ہمارے ملک کو مولانا مظہرالحق جیسے وطن دوستوں کی ضرورت ہے۔

مجاھد جنگ آزادی

عبدالعزیز انصاری

جناب عبدالعزیز انصاری جنم ۵ جولائی ۱۹۱۲ء کو تحصیل ٹھاکردوارہ ضلع مرادآباد میں ہوا تھا۔ ان کے والد کا نام عبدالرزاق انصاری تھا ان کے والد نے ان کو اچھی تعلیم دلائی تھی۔ انھوں نے کانگریس اور خلافت

کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ سیاست کا شوق ان کو بچپن سے ہی تھا۔ والد بھی ان کے ملکی آزادی کے لیے کام کر رہے تھے۔ تاحیات یہ آزادی کی جنگ میں تقویت پہونچاتے رہے۔

مجاہد جنگ آزادی

مولانا محمد میاں منصور انصاری

مولانا محمد میاں منصور انصاری کا تعلق بھی حضرت مولانا عبید اللہ کی طرح دہلی کی ولی اللہی کی اس جماعت سے تھا جسے اس کے چھٹے امام۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے ۱۹۱۵ء میں قائم کیا تھا۔ اور جماعت کا اصل منشاء یہی تھا کہ جب انگریز عالمی جنگ میں گرفتار ہیں تو ان سے حکومت چھین لی جائے۔ رولٹ ایکٹ کی رپورٹ میں مولانا محمد میاں کو "ریشمی رومال سازش" کا خاص کردار بتایا ہے۔

ولی اللہی سنگٹھن کے پانچویں امام مولانا محمد قاسم ان کے حقیقی نانا تھے ان کے والد مولانا عبد اللہ انصاری علیگڈھ یونیورسٹی میں مذہبی تعلیم کے محکمہ کے ناظم تھے۔ ان کا خاندانی سلسلہ بادشاہ اورنگ زیب کے زمانے کے صوفی فقیر شاہ ابو المعالی سے ملتا ہے جو انسانیت محبت کی ایک مورتی تھے مولانا محمد میاں کو انسانی دوستی اور انسان سے محبت کے خیال وراثت میں ملے تھے۔ آپ کو پڑھنے کے لئے دیوبند کے مولانا محمود الحسن کے پاس بھیجا گیا تھا جہاں سے انہوں نے مذہبی تعلیم کے علاوہ سیاسی تعلیم بھی حاصل کی تھی ۱۹۱۵ء کی عالمی جنگ کے وقت مولانا محمود الحسن انگریزوں کے خلاف دوسرے ملکوں سے جب مدد لینے کے خیال سے مکہ تشریف لے گئے تو مولانا محمود انصاری بھی ان کے ساتھ مکہ تشریف لے گئے۔ یہ سفر بھی خطرات سے خالی نہیں تھا اور گرفتاری کا اندیشہ لگا ہوا تھا۔ مگر سچے انقلابی ان خطروں سے کب گھبراتے ہیں، سب لوگ بخیریت مکہ پہونچ ہی گئے۔

مکہ میں مولانا محمود الحسن حجاز کے گورنر غالب پاشا سے ملے اور ان سے سرحدی قبیلوں کے لئے ایک سفارشی خط حاصل کیا۔ وہ خط انہوں نے محمد میاں انصاری کے ہاتھ سرحدی قبیلے سردار کے پاس بھیجا۔ قافلے کے ساتھ کچھ غدار جاسوس بھی تھے۔ انہوں نے اس خط کی جانکاری پہلے ہی اپنے آقا انگریز سرکار تک پہونچادی تھی۔ مولانا محمد میاں انصاری غالب نامہ کی کاپیاں بھی راستے میں تقسیم کرتے جا رہے تھے۔ اس خط میں بغاوت کرنے کی تلقین تھی۔ اس خط کو لیکر وہ حاجی فضل واحد (حاجی ترنگ زئی) تک پہونچے حاجی صاحب کچھ باتیں تو پہلے سے ہی جانتے تھے۔ انہوں نے انگریزوں کے ساتھ لڑائی بھی شروع کر رکھی تھی۔ وہ خط پانے کے بعد انہوں نے اپنا کام اور زیادہ تیز کر دیا تھا۔ کامیابی بھی ملی تھی۔ محمود میاں انصاری نے بھی حاجی جی کے کام میں بہت مدد پہونچائی تھی۔ اس کے بعد انصاری صاحب کابل کے امیر حبیب اللہ کے پاس ان کے نام کے کچھ خط دینے کے لئے گئے۔ خیال یہ تھا کہ کابل کی سرکار بغاوت میں مدد کرے گی۔ اب وہ مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے ساتھ کام کرنے لگے۔ کابل میں یعنی عارضی ہند حکومت میں بھی محمود میاں انصاری نے بہت کام کیا تھا۔ مگر امیر حبیب اللہ نے کوئی دلچسپی نہیں دکھلائی۔ اسلئے یہ حکومت کوئی ٹھوس کام نہیں کر سکی۔ وہ امیر کے خلاف ہو گئے اسلئے انہیں تخت سے اتارنے والی جماعت میں شامل ہو گئے جب انگریزی حکام نے امیر حبیب اللہ سے محمد میاں کی گرفتاری کی اجازت مانگی تو وہ فوراً دے دی گئی۔ مگر امیر کے چھوٹے بھائی نصیر اللہ نے انہیں گرفتاری سے بچا لیا۔ انہیں اپنی موٹر پر سوار کر کے افغانستان کے شمالی پہاڑی علاقے میں حفاظت سے پہونچا دیا۔

۲۰ دنوں تک پیدل سفر کے بعد مولانا محمد میاں بخارا جا پہونچے چند دن بعد ہی امیر حبیب اللہ کو قتل کر ڈالا گیا اور ان کے بیٹے امیر امان اللہ تخت نشین ہوئے تو کابل کی حکومت نے مولانا محمد میاں کو واپس کابل بلا لیا۔ کابل آکر وہ اپنے دیش کی آزادی کو نہیں بھولے اور

اور اسے حاصل کرنے کے لئے برابر کوشاں رہے۔ کچھ ہی دنوں بعد مولانا محمد میاں اور مولانا عبید اللہ سندھی صاحبان کی صلاح سے امیر امان اللہ خاں نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ لیکن ہوائی جہازوں کے نہ ہونے کے باعث یہ حملہ ناکام رہا۔ انگریزوں نے امیر امان اللہ خاں کے ساتھ صلح کر لی اور کابل کو مکمل طور آزاد کر دیا۔ مولانا محمد میاں کو مایوسی ہوئی مگر انگریزوں کے خلاف بغاوت کی مہم انھوں نے جاری رکھی۔ ان کے دوست اور پرانے ساتھی مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل چھوڑ کر چلا جانا پڑا تھا جسکا انھیں بڑا رنج ہوا۔

اب محمد میاں انصاری کو انقرہ کے سفارت خانے میں ایک بڑے عہدے پر بھیجا گیا۔ یہاں انھوں نے کافی دنوں تک کام کیا لیکن ایک دن محمد میاں کو ان کے ساتھیوں کے ساتھ روس کے جنگلات سے میں گرفتار کر لیا گیا۔ وہاں تاشقند کی جیل میں وہ تین مہینے تک رہے اس کے بعد مقدمہ ہوا اور آپ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی مگر تاشقند کے کے ایک افسر اعلیٰ نے آپ کو پھانسی سے بچا لیا۔ اس پر مولانا کی شخصیت کا بڑا اثر تھا۔ وہ وہاں سے افغانستان واپس لوٹے اب افغان سرکار نے انکو ایک مشن پر روس بھیج دیا۔ وہ وہاں لینن اور دوسرے روس کے بڑے حاکموں سے ملے اس کے بعد ہی آپ کو انقرہ کے سفارت خانہ میں اعلیٰ افسر بنا کر بھیجا گیا۔ یہاں کے کام سے جب آپ افغانستان واپس آئے تو وہ ایجوکیشن ڈائریکٹر بنا دیئے گئے۔ اور شاہ امان اللہ کے زمانے تک رہے۔

لیکن اس کے بعد ہی افغانستان میں ایک طوفان اٹھا اور بچہ سقہ نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ سب انگریزوں کی پالیسی تھی۔ اب ایک معمولی ڈاکو افغانستان کا بادشاہ بنا دیا گیا تھا۔ بچہ سقہ پر بھی مولانا محمد میاں کی قابلیت کا اثر تھا۔ اس نے انکو افغان پارلیامنٹ کا صدر بنانا چاہا مگر اس صدارت کو انھوں نے ٹھکرا دیا۔ کیونکہ اس کی مدد کرنا

انگریزوں کے مدد کرنے کے برابر تھی۔ مولانا کیونکر اسے گوارا کر سکتے تھے۔

مولانا صاحب کو ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا اور پھر پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ لیکن مولانا اتنی آسانی سے پھانسی پر چڑھنے والے نہیں تھے انہوں نے جیل کے پہرے والوں کو سلایا اور ایک رات جیل کی دیوار کود کر جیل کے باہر ہو گئے۔ بھاگ کر وہ باجوڑ پہونچے اور وہاں اسوقت تک رہے جب تک بچہ سقہ کی حکومت ختم نہ ہو گئی بعد کو وہ کابل لوٹ آئے۔ اس محب وطن نے اپنے ملک کے ساتھ غیر ممالک کی سیاست میں بھی حصہ لیا تھا محمد میاں انصاری کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ تمام انقلابوں میں انہوں نے حصہ لیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں جب ترکی میں خلافت ختم کر دی گئی تو آپ ترکی جا پہونچے۔ گویا "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

انہوں نے بہت سے ہندوستانی مجاہدوں کی مدد کی تھی۔ ہر مجاہد جنگ آزادی ان کا بھائی تھا۔

۱۹۳۷ء میں جب ہندستان کے صوبوں میں کانگریس کی سرکاریں بنی تو آپ کو کہا گیا کہ آپ برٹش حکومت سے اجازت لیکر ہندستان آجائیں مگر وہ برٹش سرکار سے اجازت مانگنا نہیں چاہتے تھے۔ اصل بات یہ بھی تھی کہ ابھی تک ہندستان میں سرکاری عمارتوں پر سے یونین جیک نہیں اترا تھا۔ مولانا کو وہ دن دیکھنا نصیب میں شاید نہیں تھا۔

۱۳ جنوری ۱۹۴۶ء کو اپنے وطن سے دور وطن کی آزادی کی مالا جپتے ہوئے ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے چلے گئے۔

شہید
بریگیڈیر محمد عثمان

محمد عثمان کا جنم یوپی کے اعظم گڈھ ضلع کے بی بی پور گاؤں میں ہوا تھا۔ وہ الہ آباد یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔ وہ کھیلوں کے

شوقین تھے۔ وہ الہ آباد اسٹوڈنٹ یونین کے بہت دنوں تک سیکریٹری رہے اور اسی وقت سے انہیں سیاست سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ ان کا داخلہ دہرہ دون کے فوجی کالج میں ہو گیا تھا۔ وہ شراب نہیں پیتے تھے اور گوشت نہیں کھاتے تھے۔

اگست ۱۹۳۴ء میں عثمان صاحب کو کمیشن ملا اور ۱۹۳۵ء میں پہلی بار لڑائی کے میدان میں گئے ۱۹۴۱ء تک ہندوستان کے مختلف حصوں میں رہے۔ بعد کو پشاور میں کپتان بھی رہے۔ کوئٹہ کے اسٹاف کالج کا امتحان دینے کے بعد آپکو عراق اور برما بھیجا گیا۔ وہ ہوائی جہاز کے محکمے میں تھے۔ پیراشوٹ کی ٹریننگ لینے کے لئے اب انھیں انگلینڈ بھیجا گیا۔ کامیاب ہو کر لوٹے۔ عثمان صاحب نیک دل انسان اور بہادر انسان تھے۔ وہ فرقہ پرستی کے سخت مخالف تھے۔ اور ہمیشہ خلق ددستی کا ثبوت دیتے تھے

۱۹۴۸ء میں جب پاکستان کے ہندو وہاں سے بھاگ کر ہندستان آرہے تھے اور ہندستان کے مسلمان پاکستان جارہے تھے تب ان کی عثمان صاحب نے حفاظت کی تھی۔ انہوں نے اپنے ہندو بھائیوں کے بچانے میں خاص دلچسپی لی انھیں گرداس پور شرنارتھیوں کے نکالنے کا کام سونپا گیا۔ وہاں امن قائم کرنے میں جو پھرتی دکھلائی اس سے اُن کا نام اور زیادہ روشن ہو گیا اس کے بعد تو ان کو جموں مورچے کا کمانڈر بنا کر کشمیر بھیجا گیا۔ کشمیر میں فرقہ پرست پبلک نے اس بات کا چرچا کیا کہ یہ لڑائی ہندو مسلم کی ہے مگر بریگیڈیر عثمان نے اس کا منہ توڑ جواب دیا اور واضح کردیا کہ یہ لڑائی فاسسٹ پاکستان کی ہندستان کی جمہوریت کے خلاف ہے۔ لڑائی کے مورچے پر ان کے چلے جانے سے سب پر جار ٹھنڈا ہو گیا۔ کیونکہ پاکستان اب ایک ایسے ملک سے لڑائی کر رہا تھا جس کی فوجی کمان خود ایک مسلمان کے ہاتھ میں تھی انہوں نے پہونچتے ہی نوشیرہ پر قبضہ کر لیا جملہ آور اسقدر گھبرائے ہوئے تھے کہ ان کے نندہ

یا مردہ پکڑ لانے کے لئے پچاس ہزار روپے کے انعام تک کا اعلان کیا گیا تھا۔ مگر جب ۵ جولائی ۱۹۴۸ء کو آل انڈیا ریڈیو نے یہ اعلان کیا کہ محب وطن فرقہ پرستی کا دشمن بہادر بریگیڈیر محمد عثمان لڑائی کے مورچے پر شہید ہو گئے تو ہندستان پر غم کی فضا طاری ہو گئی۔

مشہور مجاہد جنگ آزادی

مولانا غلام حسین

مولانا غلام حسین شہر مرادآباد اتر پردیش کے رہنے والے تھے آپ کے دل میں سیاست کا جذبہ پیدائش تھا۔ مرادآباد میں تعلیم حاصل کی اور پھر سیاست کے میدان میں کود پڑے۔ آپ جب دیوبند مدرسہ کے مولانا حسین احمد مدنی کی قربت میں آئے تو وطن پرستی کے جذبہ نے اور زیادہ زور پکڑا آپنے ۱۹۴۲ء کی انگریز بھارت چھوڑو تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ پبلک میں انگریزوں کے خلاف آپ باغیانہ تقریریں کرتے تھے ۱۰ اگست ۱۹۴۲ء کو آپنے مرادآباد میں ایک جلوس کی قیادت کی تو آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ آپ کے اوپر مقدمہ چلا اور آپ کو ایک سال کی سزا ملی اور ایک سو روپیہ جرمانہ بھی کیا گیا۔ جیل میں آپ کے ساتھ مولانا حسین احمد مدنی و حافظ ابراہیم اور مولانا حفظ الرحمان جیسے مشہور مجاہد جنگ آزادی تھے

مولانا غلام حسین شروع سے ہی سیکولر نظریات کے علمبردار تھے مولانا قریب ۳۰ برسوں سے جمیعت العلماء ہند کے ذریعہ ملک و قوم کی خدمت کرتے رہے۔

مجاہدِ آزادی

جناب حبیب الرحمٰن انصاری

جناب حبیب الرحمٰن انصاری تحصل قنوج ضلع فرخ آباد اترپردیس میں ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے تھے اور انکی وفات ۱۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو ہوئی تھی آپکے والد کا نام حافظ عبدالصمد انصاری تھا جو زبردست عالم و فاضل تھے آپ نے بھی علیگڈھ مسلم یونیورسیٹی سے اعلیٰ تعلم حاصل کی تھی۔ آپکو سیاست سے دل چسپی ضرور تھی مگر وہ جیل جانے سے محروم رہے یوں آپ نے ملک کی بڑی خدمت کی ہے اور زندگی بھر کھادی کے کپڑے پہنتے رہے آپکے اندر تقویٰ، پرہیزگاری اور اخوت کا جذبہ تھا اور آزادی کی تڑپ تھی۔ ۱۹۲۱ء میں جب مہاتما گاندھی نے ستیہ گرہ (عدم تشدد) کی تحریک چلائی تو آپ نے اس میں نمایاں حصہ لیا۔

جناب حبیب الرحمٰن انصاری صاحب پہلی بار ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے مقابلہ میں یو۔پی اسمبلی کی سیٹ کے لئے کانگریس کے ٹکٹ پر منتخب ہوے اور دوسری بار پھر کانگریس کے ٹکٹ پر ۱۹۵۲ء میں یو۔پی اسمبلی کیلئے منتخب ہوئے۔ یہ ثبوت ہے جناب حبیب الرحمٰن کی ہر دلعزیزی اور انسان دوستی کا۔

مجاہد آزادی

محمد یٰسین انصاری

جناب محمد یٰسین انصاری ہزاری باغ ضلع کے قصبہ سادم۔ گوریا میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی بعد کو پٹنہ کالج میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ طالب علمی میں ہی سیاست کے میدان میں کود پڑے تھے۔ آزادی

کے دیوانہ بن کر چھوٹا ناگپور کے جنگلی اور پہاڑی علاقے میں آزادی کا پیغام پہونچانے کے لئے کام کرتے رہے ۔ ۳۷-۱۹۳۶ء کے صوبائی انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تو حکام کی نظروں میں آ گئے ۔ ہزاری باغ کا حکومت پرست راجہ پد ملنے محمد یٰسین کی سخت مخالفت کی مگر پبلک انکے ساتھ تھی ۔ انکے جلسوں میں ہی بھیڑ دیکھی جاتی تھی ۔ راجہ نے انکے والد شیخ پیر بخش کو حکم بھیجا کہ وہ اپنے لڑکے پر کنٹرول رکھیں مگر یہ کب ممکن تھا ۔ انگریزی حکومت کے خلاف کام کرنے کے لئے وارنٹ جاری ہوا تو آپ روپوش ہو گئے ۔ مگر وہ تو اس درمیان اتنے زیادہ مشہور ہو چکے تھے کہ روپوش رہ ہی نہیں سکتے تھے ۔ ۱۹۴۲ء میں گرفتار کر ہی لئے گئے ہزاری باغ کی مرکزی جیل میں بند کئے گئے ۔ بعد کو ضمانت پر رہا کر دے گئے ۔ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے خلاف کانگریس کی ٹکٹ پر چناؤ لڑا اور کامیاب ہوئے ۱۶ ستمبر ۱۹۷۵ء کو ایک لمبی بیماری کے بعد اپنے گاؤں سادم میں وفات پائی

مجاہد آزادی
مولانا منصور علی

مولانا منصور علی ضلع بھاگلپور کے رہنے والے تھے ۔ یہ پیدائشی دیش بھگت تھے انکے والد اور دادا نے انگریزی حکومت کو کبھی پسند نہیں کیا ۔ مدرسہ شاہی مسجد مرادآباد میں عربی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ۔ ۱۹۴۲ء میں بھارت چھوڑو تحریک میں حصہ لیا ۲۴ ستمبر ۱۹۴۲ء کو مرادآباد میں ایک بڑا جلوس نکالا تو آپکو گرفتار کر لیا گیا ۔ آپکو ایک سال کی سخت سزا دی گئی اور پچاس روپیہ جرمانہ کیا گیا

راوڈکیلا کے مجاہدین آزادی

ان مجاہدین آزادی کے یہاں صرف نام دئے جا رہے ہیں ۔
(۱) جناب امانت علی انصاری (۲) جناب نعمت علی انصاری ۔
(۳) جناب عنایت علی انصاری ۔ (۴) جناب حاجی عبدالستار
(۵) جناب محمد منصور ولد محمد طاہر علی انصاری (۶) جناب محمد شریف انصاری

(۷) جناب اسلام الدین انصاری (۸) جناب محمد شریف انصاری
(۹) جناب عبدالحمید ولد عبدل میاں اور
(۱۰) جناب جمال انصاری

مومن مسلمانوں نے ملک کی آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ مومن جماعت کے بہت سے لوگوں نے نہ صرف جیل کی تکلیفیں اٹھائیں بلکہ انھوں نے گولیاں بھی کھائیں اور پھانسی پر بھی چڑھے ۔

مجاھد آزادی

چودھری اسلام الدین اور حکیم حاذق

(۱) چودھری اسلام الدین عرف چمٹن ولد عبدالغنی آپ ۱۸۱۸ء میں ضلع مراداباد (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے تھے بعد کو آپ دہلی چلے گئے آپ نے ۱۹۳۲ء میں آزادی کی تحریک میں کام کیا تھا۔

(۲) طبیب حکیم حاذق امدادی قریب ایک لمبی عمر تک کانگریس کے ممبر رہے اور ۱۹۴۲ء کی آزادی تحریک میں حصہ لیکر جیل گئے ۔

(۳) مجاھد آزادی

جناب مقصود علی

آپ کے والد کا نام نور علی تھا۔ انکا جنم سلطانپور گاؤں ضلع ویشالی (بہار) میں ۱۸۷۹ء میں ہوا تھا۔ آپ پچھم بنگال کی جوٹ مل میں ہیڈ کلرک تھے۔ انہوں نے ۱۹۲۱ء میں آزادی تحریک میں حصہ لیا اسوقت مسلم زمیندار مومنوں کا استحصال کر رہے تھے۔ انہوں نے انکی سخت مخالفت کی ملک کی آزادی کے لئے کام کرتے ہوئے آپ کا ۱۹۳۷ء میں انتقال ہوا ۔

مجاہد آزادی عبدالمجید انصاری

جناب عبدالمجید انصاری پسر جناب عبدل انصاری کا جنم ۱۹۲۳ء میں موضع فتح پور کمالی میں ہوا تھا۔ یہ نوجوان بہت جوشیلا تھا اور وطن کی آزادی کا دل دادہ تھا۔ ۱۹۴۲ء کے "انگریز بھارت چھوڑو تحریک" میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ انھوں نے ۱۷ افراد کی ایک ٹولی بنا کر ایک تھانے پر قبضہ کر لیا تھا جو کئی دنوں تک رہا۔ ۳ ستمبر ۱۹۴۲ء کو فوج آئی تو اسنے جناب عبدالمجید انصاری کا گھر پٹرول چھڑک کر جلا دیا۔ جب انگریزی حکومت کا ظلم بہت زیادہ بڑھ گیا تو یہ لوگ فرار ہو گئے اور پٹنہ جا پہونچے اور یہاں کام کیا۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو گرفتار کئے گئے اور پٹنہ جیل میں بند کئے گئے ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو سٹی مجسٹریٹ نے ایک سال کی سزا اور ۲۵ روپیہ جرمانہ کا حکم دیا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو انکے اوپر ایک دوسرا بغاوت کا مقدمہ چلا اور اسمیں بھی انکو ایک سال کی سزا اور ۲۵ روپیہ جرمانہ کا حکم سنایا گیا تھا۔ ابھی سزا ہی بھگت رہے تھے کہ منہار تھانہ کا وارنٹ جیل میں لایا گیا اور انکو اپنی ضلع جیل مظفرپور بھیج دیا گیا۔ یہاں ان پر پھر ایک مقدمہ چلا اور مظفرپور کے اسپیشل جج نے ایک بار انکو ۲ فروری ۱۹۴۳ء کو ۴ سال کی سزا دیکر بھاگل پور کیمپ جیل میں بھجوا دیا۔ اسکے بعد بھی انکو چین نہیں ملا۔ ایک بار حاجی پور کے ایس۔ ڈی۔ او نے بھی ان پر اپنا غصہ اتارا اور ۴ جون ۱۹۴۵ء کو ۶ مہینے کی سزا دیکر بھاگلپور کیمپ جیل میں واپس بھیج دیا۔ یہ چار جون ۱۹۴۶ء کو کانگریس کی منسٹری بن جانے پر جیل سے رہا کر دئے گئے۔ اس سے اندازہ لگتا ہے کہ یہ کتنے بڑے انقلابی تھے۔

مالیگاؤں ضلع ناسک (مہاراشٹر) کے پھانسی پانے والے مجاہدین آزادی

۱۹۲۲ء میں خلافت تحریک نے مہاراشٹر میں بہت زور پکڑا۔ اسوقت کانگریس اور خلافت کی دونوں تحریکیں ایک ساتھ چل رہی تھیں۔ ہندو اور مسلمانوں میں ایسی ہل چل بھی شباب پر تھا۔ شراب کی دوکانیں بند کرائی

جا رہی تھی۔ والنٹیر دوکانیں زبردستی بھی بند کرا دیتے تھے۔ مالیگاؤں (ناسک) میں خلافتی مسلمانوں نے شراب کی دوکانیں بند کرانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایک دن شراب کی دوکان پر پکیٹنگ کرتے ہوئے فساد ہو گیا۔ ایک پولس کانسٹیبل جان سے مارا گیا اس پر پولس نے بہتوں کو گرفتار کیا جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا اسمیں مومن جماعت کے چار مشہور کارکن (۱) محمد شعبان بھکاری (۲) محمد سلمان شاہ (۳) اسرائیل اللہ رکھا اور (۴) بدھو فریدن کو ۲ جولائی ۱۹۲۲ء کو یرودا جیل (ناسک) میں پھانسی دی گئی تھی اسکے علاوہ مالیگاؤں کے ہی پہلوان عبد الغفور کو ۱۸ جنوری ۱۹۲۳ء کو یرودا جیل میں پھانسی پر چڑھایا گیا تھا۔

مجاہدین آزادی جن کا قیدی کی حالت میں ہی جیل میں انتقال ہو گیا تھا۔

انگریزی سرکار مالیگاؤں کے مسلمانوں پر کچھ زیادہ ہی سختی کر رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو مسلمان کانگریس کی اس تحریک کے ساتھ بندھے ہوئے نہیں تھے جس میں عدم تشدد پر زیادہ زور دیا جا رہا تھا وہ تو خلافت تحریک کے ساتھ تھے جو ملک کی آزادی تو چاہتی تھی لیکن اسکا زور "عدم تشدد" پر اتنا نہیں تھا۔ شراب کی دوکان پر پکٹنگ کرتے ہوئے جہاں پولس نے فائرنگ کی تھی وہاں ان جوشیلے نوجوانوں نے اینٹ پتھروں سے کام لیا اور ایک پولس مین کو مار بھی ڈالا تو ان پر زیادہ سختی کی گئی اور جیل میں ہی انہیں ہلاک کر ڈالا گیا۔ جیل میں ہوئی سختیوں اور ظلم کے شکار حسب ذیل ہیں۔

(۱) جناب محمد حسین حاجی محمد دیسٹو۔ ان کو تین سال کی سزا ہوئی تھی اور انکا انتقال تھانہ جیل میں ہوا تھا۔

(۲) جناب عبد اللہ خلیفہ خدا بخش۔ انہیں بھی تین سال کی سزا ملی تھی انکا انتقال جیسی پور کی جیل میں ہوا تھا۔ یہ لوگ جیل کی سختیوں کا شکار ہوئے تھے۔

خلافت کی تحریک کے سلسلے میں عمر قید کی سزا پانیوالے حضرات

(۱) عبدالواحد حاجی محمود۔ ۲۲ سال کی سزا اور گاندھی اروِن پیکٹ کے مطابق رہا ہوئے تھے۔ انکے علاوہ جنھیں عمر قید ہوئی تھی اور جنھیں مرنے کے لئے دفعہ دراز عدن کی جیل میں بھیجا گیا تھا ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) بابو امام بخش گڑاکو والے (۲) محمد یوسف سدھو (۳) بابو اللہ الدین (۴) مولانا امیر نور محمد (۵) جناب ایوب بھیکوارا (۶) جناب سلامت میڑ نخاصہ۔

مجاہدین آزادی

مالیگاؤں ضلع ناسک مہاراشٹر

ان مجاہدین کی فہرست بہت لمبی ہے لہذا انکے صرف نام دیئے جاتے ہیں، اور وہ بھی بہ شکریہ آل انڈیا مومن کانفرنس نمبر ۱۹۶۶ء سے۔

۱ جناب عبدالرحیم
۲ جناب عبدالغفور سدھلی
۳ جناب اسمٰعیل ریدن محمد
۴ جناب سدو قاضی
۵ جناب محمد یوسف عبداللہ
۶ جناب حبیب اللہ رسول
۷ جناب جان محمد بدو
۸ جناب عبداللہ نزہو
۹ جناب بالو جبہ
۱۰ جناب احمد محمد۔
۱۱ جناب شفیع اللہ روزن
۱۲ جناب شیراتی بشارت
۱۳ جناب معین الدین سلامت
۱۴ جناب نور نبی
۱۵ جناب کریم داؤد

۱۶ جناب بابو اللہ دین
۱۷ جناب اسحاق مجیب
۱۸ جناب رمضان لال محمد
۱۹ جناب مدار بخش رمضان
۲۰ جناب صادق مدار بخش
۲۱ جناب محمد حیات عبدالرحیم
۲۲ جناب محمد حسن محمد بخش
۲۳ جناب عبدالمجید طیب حاجی غفور
۲۴ جناب محمد الٰہی
۲۵ جناب رمضان بن احمد
۲۶ جناب چھگن شیراتی
۲۷ جناب تاج محمد باقر
۲۸ جناب عبدالواحد حاجی
۲۹ جناب اسمٰعیل ابراہیم
۳۰ محمد روشن بوبو محمد

۳۱ جناب عبدالرزاق ابراہیم
۳۲ جناب محمد شفیع میکو سردار
۳۳ جناب مدّو بھو
۳۴ جناب چمن بھیکو
۳۵ جناب فتح محمد قدرت
۳۶ ظہور حاجی رحیم بخش
۳۷ جناب عبدالغفور رحیم بخش
۳۸ جناب حبیب ہیر
۳۹ جناب قاسم رحمت اللہ
۴۰ جناب حبیب سبحان
۴۱ جناب بشیر عبداللہ
۴۲ جناب حشمت اللہ فتح محمد
۴۳ جناب نور محمد عیدو
۴۴ جناب عبدالغفور کریم پان والا
۴۵ جناب جان محمد عیدو
۴۶ جناب محمد اسحاق کرامت سردار
۴۷ جناب محمد بلوی
۴۸ جناب یعقوب یتیم
۴۹ جناب رمضان خدا بخش
۵۰ جناب عبدالغفور الٰہی بخش
۵۱ جناب قاسم عبداللہ
۵۲ جناب عبدالغفور
۵۳ جناب عبدالکریم عبداللہ
۵۴ جناب نسیم اسحاق
۵۵ جناب عبدالمجید محمد سردار

۵۷ جناب محمد یوسف ابراہیم
۵۸ جناب محمد یعقوب حیات
۵۹ جناب قادر بدھو
۶۰ جناب محمد تیلو
۶۱ جناب بشیر امام بخش
۶۲ جناب دل محمد الٰہی بخش
۶۳ جناب عبدالقادر عنایت اللہ
۶۴ جناب عیسٰی صاحب دین
۶۵ جناب محمد لال محمود جوہر منشی
۶۶ جناب ظہیر الدین روشن علی
۶۷ جناب عبدالرحیم جگو سردار
۶۸ جناب ایوب رمضان
۶۹ جناب اکبر یعقوب
۷۰ جناب محمد حسین خدا بخش
۷۱ جناب جمّن فتو
۷۲ جناب رمضان سنگر
۷۳ جناب محمد ابراہیم
۷۴ جناب عبدالرحیم حاجی عبداللہ
۷۵ جناب عبدالکریم حاجی اسمٰعیل
۷۶ جناب حبیب اللہ یاد اللہ
۷۷ جناب کمال جمّن
۷۸ جناب عظیم عبدالرحیم
۷۹ جناب اسحاق غفور
۸۰ جناب عبدالمجید نعمت
۸۱ جناب مولوی محمد اسحاق محمد امیر

۸۳ جناب محمد صدیق محمد علی
۸۴ جناب وہاب عبد الغفور
۸۵ جناب مولوی عزیز الرحمٰن مطوار سیدا یر
۸۶ جناب بدھو صاحب بدرین
۸۷ جناب ابراہیم سبراتی
۸۸ جناب اسحاق جعفر
۸۹ جناب زین العابدین مولا بخش
۹۰ جناب حبیب اللہ ابن حاجی قدرت مرحوم
۹۱ جناب قاضی محمد صدیق صاحب

بمبئی کے مجاہدین آزادی

۱ جناب نور الدین انصاری مرحوم
۲ جناب محمد یعقوب انصاری ،،
۳ جناب محمود انصاری ،،
۴ جناب عبد المجید لال بادشاہ ،،
۵ جناب علی محمد فتح علی ،،
۶ جناب عبد المجید انصاری مرحوم
۷ جناب سعید احمد انصاری ،،
۸ جناب صدیق سردار ،،
۹ جناب لطیف کیپٹن ،،
۱۰ جناب سلامت فخرا بادشاہ ،،
۱۱ جناب حاجی الیاس ،،
۱۲ عبد الجلیل انصاری ،،
۱۳ محمد امین محمد ادریس ،،
۱۴ جناب محمد امین جلیل حصو ،،
۱۵ جناب سعید احمد ملکی ،،
۱۶ جناب اصغر انصاری مرزا پوری
۱۷ جناب بشیر پیٹر
۱۸ سعد اللہ مقادم
۱۹ جناب محمد حسین پیٹر
۲۰ جناب منظور الحق اعظمی
۲۱ جناب محمد ظہور الحق خورشید مرحوم
۲۲ جناب عبد اللطیف خادم
۲۳ جناب غلام نور الحق غلام حسین انصاری
۲۴ جناب یٰسین منظر
۲۵ جناب یٰسین سلیم اللہ
۲۶ جناب محمد بشیر انصاری مرحوم
۲۷ جناب علی محمد شمس الدین
۲۸ جناب یوسف نعیم
۲۹ جناب عبد المجید عبد اللہ انصاری
۳۰ جناب عبد الرحمٰن چکی والے
۳۱ جناب نور محمد مومن
۳۲ جناب اشرف بن یحییٰ
۳۳ جناب عبد المجید لیڈر (ناگپوری)

مومن مجاہدینِ آزادی

۱ محمد اسرافیل بھاگلپور
۲ بی بی رسول جہاں زوجہ ناظر علی
۳ رمضان انصاری بھاگلپور
۴ بشیر احمد ولد عبد الغفور (مومن)
۵ نذیر احمد ولد عبد الغفور (〃)
۶ محمد علی انصاری ولد دلال میاں دربھنگہ

جنگِ آزادی کے شہید

جولاہی میاں انصاری اور ساتھی

۱۔ شہید جولاہی میاں انصاری ولد الہی میاں انصاری ساکن چمپانگر ضلع بھاگلپور (بہار) کے رہنے والے تھے۔ آپ ایک جوشیلے نوجوان تھے اور ملک کی آزادی کے کام کر رہے تھے۔ ناتھ نگر سے ۱۰ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کو آزادی کا جلوس نکلا تو آپ نے اس میں بھی حصہ لیا اور آزادی کے نعرے لگائے۔ پولس نے جلوس پر گولی چلا دی اور آپ گولی کھا کر شہید ہو گئے۔

۲۔ مجاہد عقیل الدین ولد مولا بخش بھی موضع چمپانگر کے رہنے والے تھے۔ آپ بھی ۱۰ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کے دن نکلنے والے آزادی کے جلوس میں شامل تھے۔ پولس نے جب جلوس پر گولی چلا دی تو ایک گولی سے آپ زخمی ہو گئے۔ اس حالت میں پولس نے آپ کو گرفتار کر لیا۔ آپ پر مقدمہ چلا اور آپکو آٹھ مہینے کی سزا دی گئی۔ سزا کاٹ کر آپ بھاگلپور کی جیل سے رہا ہوئے۔

۳۔ مجاہد جنگِ آزادی جمال الدین ولد زین العابدین یہ بھی چمپانگر ضلع بھاگلپور کے رہنے والے تھے۔ ۱۰ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کے جلوس میں گولی کھا کر زخمی ہو گئے تھے۔ آٹھ ماہ کی سزا ہوئی اور بھاگلپور جیل میں رکھے گئے۔

۴۔ مجاہد جنگِ آزادی عبدالرشید ولد مولانا یعقوب بھی موضع چمپانگر ضلع بھاگلپور کے رہنے والے تھے۔ یہ بھی جلوس میں گولی کھا کر آٹھ مہنے تک بھاگلپور کی جیل میں رہے تھے۔

۵۔ مجاہد جنگِ آزادی مولانا غلام حسین پسر تاج الدین بھی چمپانگر ضلع بھاگلپور کے رہنے والے تھے۔ یہ مراد آباد اُتر پردیش کے شاہی مدرسہ کے طالب علم تھے۔ مراد آباد میں ۱۷ ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء کو انگریز بھارت چھوڑ دو [illegible] بڑا جلوس نکلا۔ جناب غلام حسین صاحب

نے بھی نعرے لگائے تھے ــــ پولس نے آپ گرفتار کر لیا
اور آپ پر انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کا الزام عائد کیا گیا
اور آپ کو ایک سال کی قید اور پچاس روپیہ جرمانہ کی سزا سنائی گئی آپ کو
مرادآباد کی جیل میں رکھا گیا۔ اسی جیل میں اسوقت حضرت مولانا سید
حسین احمد صاحب مدنی، مولانا محمد حفیظ الرحمٰن صاحب۔ حافظ محمد ابراہیم صاحب
مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی اور راؤ دیال کھنہ سابق ہیلتھ منسٹر یوپی
بھی نظر بند تھے۔

۲۶۷ مجاہد جنگِ آزادی مولانا محمد منصور علی صاحب بھی موضع چپا نگر
ضلع بھاگلپور کے رہنے والے تھے۔ اور اتر پردیش کے ضلع مرادآباد
کے شاہی مدرسہ کے طالب علم تھے۔ آپکے والد کا نام عبد السلام (مرحوم) تھا
آپ سنہ ۱۹۴۲ء میں مرادآباد کے شاہی مدرسہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے ــــ
دل میں ملکی آزادی کا جذبہ تھا۔ مرادآباد میں جب اگست سنہ ۱۹۴۲ء میں کانگریس
کا ایک جلوس "انگریزو بھارت چھوڑدو" کے نعرے لگاتے ہوئے نکلا تو یہ اپنے
اسکول کو چھوڑ کر اس جلوس میں شامل ہو گئے اور جلوس کی رہنمائی کی۔ پولس
نے آپکو گرفتار کر لیا۔ ان پر مقدمہ چلا اور انھیں ایک سال کی سزا اور پچاس
روپیہ جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ ستمبر سنہ ۱۹۴۳ء میں رہا ہوئے۔

مجاہد جنگِ آزادی

جناب عین الحق صاحب

جناب عین الحق پسر جناب مقصود علی (مرحوم) تھے۔ انہوں نے بھی
تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ منہار تھانہ (سلطانپور) پر قبضہ کرنے
میں انکا بھی ہاتھ تھا۔ جب انکے خلاف وارنٹ جاری ہوا تو یہ فرار ہو کر
دربھنگا چلے گئے۔ یہاں انکے کچھ رشتہ دار تھے جنھوں نے انھیں اپنے
گھر میں نہ ٹھہرنے دیا۔ ایسی حالت میں یہ خانہ بدوشی کی حالت میں گھومتے
تھے اور رات میں بازار کی بند دوکان کے باہر پڑی بنچ پر شب گذار دیتے

کرتے تھے۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں جب مقدمہ فتح ہوگیا تب ہی اپنے گھر کو واپس آئے تھے۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں
مومن مجاہدین چمپارن کا حصہ

جناب پیر محمد مونس انصاری صاحب۔ آپکے والد کا نام تھنگن میاں تھا۔ آپ بتیا محلہ گنج دوئم کے باشندہ تھے۔ آپکی پیدائش ۱۸۹۲ء میں ایک متوسط گھرانے میں ہوئی تھی اور آپکا انتقال ۲۴ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ہوا آپ بچپن ہی سے انقلاب پسند تھے۔ انگریزی حکومت سے سخت نفرت تھی۔ ہندی زبان کے عالم تھے۔ ۱۹۳۷ء میں بہار پرانتی ساہتیہ سمیلن کے آپکو صدر بنایا گیا تھا۔ انھوں نے "۱۹۰۷ء میں چمپارن پر انگریزوں کا اتیاچار" ایک کتاب لکھی تھی جو ضبط کر لی گئی۔ انکی ساری جائداد ضبط کرلی گئی۔ ان کو کئی بار جیل بھی جانا پڑا تھا۔ جب گاندھی نے چمپارن میں نیلہے انگریزوں کے مظالم کیخلاف ستیہ گرہ کیا تو یہ مرد مجاہد پیش پیش تھا۔ آپ کی زندگی اس معانی میں کامیاب رہی کہ جس آزادی کے لئے آپ زندگی بھر کوشش کرتے رہے اُسکو آپ نے اپنے حیات میں دیکھ لیا۔

شری مونس صاحب کو ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر چمپارن ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر چناگیا۔ اور بیتیا۔ (Betia) لوکل بورڈ کا چیرمین چناگیا ۱۹۳۹ء میں کانگریس کے حکم سے استعفی دیدیا اور انفرادی ستیہ گرہ کیا۔ جیل گئے اسکے قبل ۱۹۳۰ء میں آپ نے نمک قانون بھی توڑا تھا اور جیل گئے تھے۔

انھوں نے تمام عمر ملک کی خدمت میں صرف کردی تھی۔ یہ سچے مجاہد جنگ آزادی تھے۔

مجاہد آزادی

جناب نجابت حسین انصاری (مرحوم)

جناب نجابت حسین انصاری ضلع رانچی (بہار) کے رہنے والے تھے۔ یہ ایسے شخص تھے جن سے نہ صرف اپنی مومن برادری کو بہت فائدہ پہونچا بلکہ کانگریس کو بھی فائدہ پہونچا تھا۔ اپنے حلقے میں وہ کانگریس کے ایک ستون تھے۔

جناب نجابت حسین انصاری کی پیدائش رانچی سے ۴۰ میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں ۱۸۹۶ء میں ہوئی تھی۔ اُنکے والد جناب رحیم بخش اسکول ماسٹر تھے۔ تعلیم حاصل کرنیکے بعد ٹیچر ہوگئے۔ سماج سیوا کے کاموں میں بہت دلچسپی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں پبلیسٹی ڈپارٹمنٹ کے تحت رپورٹر کے عہدے پر سرکار نے ان کو چھپرا بھیج دیا۔ اسوقت تحریک آزادی ملک میں زور پکڑ چکی تھی۔

جناب نجابت حسین نے پبلیسٹی ڈپارٹمنٹ میں صرف ایک ہی سال تک ابھی کام کیا تھا کہ ملک کی پکار پر انہوں نے نوکری کو ٹھکرادیا اور کانگریس میں شامل ہوگئے اور بڑی گرمجوشی سے کام کیا۔ رانچی میں مسلم لیگ کی ہار میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ گرام سدھار کے کاموں میں انکے ذریعہ دلچسپی لئے جانے کی وجہ سے انکا گاؤں بہار شریف میں اوّل رہا۔ بلاک کانگریس کے یہ صدر تھے۔ خدمت وطن کیوجہ سے انکو لوگ علاقائی گاندھی کہتے تھے۔ ۲/ اگست ۱۹۷۱ء کو اس محب قوم و وطن کا انتقال ہوگیا۔

مُجَاہِدِ جَنگِ آزادی

جنّت حسین انصاری

ملک کے لئے جناب جنّت حسین انصاری کی قربانی کم معنی نہیں رکھتی ہے۔ آپ تو پہلے گورنمنٹ کی سی۔ آئی۔ ڈی ڈپارٹمنٹ میں

ملازم تھے۔ ۱۹۴۰ء میں کانگریس کا رام گڑھ میں جلسہ ہوا۔ وہاں منعقدہ کانگریس سیشن میں گاندھی جی سبھاش چندر بوس اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیتوں کے لیکچروں کا آپ کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ آپ کی ضمیر نے آپکو شرمندہ کیا کہ ایک آپ ہیں جو انگریزوں کی غلامی کر رہے ہیں اور انکی خیر خواہی میں لگے ہیں اور غلامی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اپنے وطن کے ایک وہ لوگ ہیں جو سرکاری نوکری کو حرام سمجھتے ہیں اور وطن کو غلامی سے نجات دلانے کی کوشش کر رہے ہیں آپ اپنی نوکری سے مستعفی ہو گئے اور پھر کانگریس میں کام کرنے لگے۔

انگریزی سرکار نے مرحوم جنت حسین کے خلاف وارنٹ جاری کیا تو آپ فرار ہو گئے اور ایک جنگل کو آباد کیا۔ اس فراری کی حالت میں بھی وہ کانگریس کا کام برابر کرتے رہے۔ گاؤں گاؤں گھوم کر کانگریس والنیٹروں کے لئے اناج اکٹھا کرتے تھے۔

مجاہد جنگِ آزادی

جناب امانت علی انصاری

جناب امانت علی انصاری کا جنم پہلی جنوری ۱۹۲۰ء کو موضع بنڈو ضلع رانچی (بہار) میں ہوا تھا۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ملک و قوم کی خدمت کی۔ کانگریس سے بھی وابستہ رہے۔ طالب علموں کے اور کانگریس سیوا دل کے جلوسوں میں برابر شریک ہوتے رہتے۔ ۱۹۴۵ء میں جب کانگریس کے کارکن اور لیڈر جیل سے رہا ہوئے تو امانت علی صاحب نے ان کا شاندار سواگت کیا۔ اسٹوڈینٹس کانگریس کی تنظیم کے آپ سکریٹری بنائے گئے تھے۔ گاؤں کی گرام سبھا میں آپ نے نمایاں حصہ لیا۔ ۱۹۴۵ء میں پٹنہ میں آل انڈیا اسٹوڈینٹس کا جلسہ ہوا اسمیں بھی آپ نے اپنے ضلع کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے حصہ لیا۔

اگر جناب امانت علی ۱۹۳۰ء سے پہلے پیدا ہوئے ہوتے تو انھوں نے آزادی کی تحریک میں حصہ لیکر بہت کام کیا ہوتا۔ کیونکہ آپ کے دل میں وطن کی خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ آزادی کے بعد بھی جو خدمت اُن سے ہو سکی اس میں وہ پیش پیش رہتے تھے۔ اس محبِ وطن کا انتقال ۴ نومبر ۱۹۸۴ء کو ہو گیا۔

حاجی عبداللہ سردار عرف بیگا میاں

جناب بیگا میاں ضلع رانچی بہار کے رہنے والے تھے۔ یہ اپنی مومن برادری کے لیڈر تو تھے ہی کانگریس کے کئی برسوں ممبر رہے۔ بہت باثر آدمی تھے۔ یہ مسلم لیگ کے خلاف تھے اور انھوں نے ملک کی تقسیم کو کبھی پسند نہیں کیا۔ ۱۹۴۲ء کے انگریزو! بھارت چھوڑ دو تحریک میں بھی انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ انھوں نے مومن جماعت کی بہت خدمت کی۔ اس محب وطن کا انتقال ۴ جنوری ۱۹۷۳ء کو ہو گیا جسکا بہت افسوس کیا گیا۔ مجاہدِ جنگِ آزادی تو نہیں تھے مگر محبِ وطن ضرور تھے۔

مُجاہدِ جنگِ آزادی

جناب عبدالعزیز (مرحوم)

جناب عبدالعزیز کا جنم ۲۶ جنوری ۱۹۱۱ء میں بمقام رسیا گاؤں ضلع چھپرا (بہار) میں ہوا تھا اور ان کا انتقال ۵ ۲ دسمبر [illegible]ء میں ہوا ۱۹۴۲ء کے انگریزو! بھارت چھوڑ دو تحریک میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا آپ کو گرفتار کیا گیا۔ جیل کی سزا کاٹی۔ آپکی ملکی خدمات کو ملحوظ رکھکر وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے آپکو اعزازی "تامر پتر" سے نوازا تھا

مجاہد جنگ آزادی

شیخ بھکاری کو پھانسی

جب ملک میں ۱۸۵۷ء میں پہلی جنگِ آزادی کے شعلے بھڑکے تو چھوٹا ناگپور میں بڑکاگڑھ کے راجہ ٹھاکر وشوناتھ شاہ نے بھی انگریزوں کے خلاف تلوار اٹھائی تھی۔ چھوٹا ناگپور کے مومن نوجوان سر سے کفن باندھ کر شیخ بھکاری کے پرچم تلے جمع ہوئے، سلامت علی اور شیخ بھکاری دونوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ سنتھال پرگنہ دمکا میں انگریزوں کے کیمپ پر دھاوا بول دیا۔ چھوٹا ناگپور انگریزوں سے خالی ہوگیا۔ مگر نئی کمک پاکر انگریزوں نے پھر حملہ کردیا۔ شیخ بھکاری نے چٹوپالو گھاٹ پر انگریزوں کو آگے بڑھنے سے روکا، گھمسان کی جنگ ہوئی۔ شیخ بھکاری کو ۶ جنوری ۱۸۵۸ء کو گرفتار کر لیا گیا۔

جنرل میکڈونلڈ نے شیخ بھکاری کو گرفتاری کے فوراً بعد اُنکا مقدمہ ایک فوجی عدالت کے سپرد کردیا۔ اس عدالت نے شیخ بھکاری کو باغی قرار دیا اور پھانسی کا حکم دیا جو انگریزی حکومت کے لئے ایک عام بات تھی۔ اس جنرل نے شیخ بھکاری کو بہت خطرناک بتایا تھا۔ چٹوپالو گھاٹ کے ایک درخت پر ۸ جنوری ۱۸۵۸ء کو شیخ بھکاری کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ شیخ برو، جو شیخ بھکاری کے ساتھ گرفتار ہوئے تھے انہیں حبس دوام کی سزا دی گئی۔ انگریزی حکومت کی داستانِ مظالم بڑی طویل ہے۔

چمپارن (بہار) کے دیگر مجاہدینِ جنگِ آزادی

جناب حافظ دین محمد انصاری

آپ چنپٹیا کے رہنے والے ایک امیر خاندان سے تھے۔ آپ ۱۸۸۱ء میں

پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۶۱ئ میں وفات پائی۔ انگریزی حکومت سے آپ بہت نالاں تھے۔ چمپارن میں انگریزوں کی نیل کی کوٹھیاں تھیں اور وہ لوگ مزدوروں کا اور غریب جنتا کا بہت استحصال کرتے تھے۔ شیخ گلاب نے جب انگریزوں کے ظلموں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تو آپ نے شیخ گلاب کی بہت مدد کی۔ حافظ دین محمد نے ہی ان لوگوں کو روپیہ دیا جو گاندھی جی کو چمپارن آنے کی دعوت دینے گئے اور گاندھی جی چمپارن آئے۔ حافظ دین محمد انصاری اپنے انتقال کے وقت تک آزادی کے لئے کانگریس کے ساتھ رہے۔

جناب بطخ میاں انصاری

چمپارن کے نیلی انگریزوں نے جناب بطخ میاں انصاری کو بڑی جاگیر کا لالچ دیا کہ مہاتما گاندھی کو زہر کا پیالہ پلا کر مار ڈالیں۔ انھوں نے زہر کا پیالہ لیکر گاندھی جی کو بتا دیا کہ آپکے جانی دشمن انگریزوں نے آپکی جان لینے کے لئے یہ زہر کا پیالہ بھیجا ہے تو گاندھی جی نے اسے لیکر پھینک دیا اس طرح بطخ میاں انصاری نے اپنی انسان دوستی کا ثبوت دیا تھا اور بعد کو وہ برابر کانگریس کا کام کرتے رہے۔

محمد سعید انصاری

آپ کے والد کا نام عبدال میاں تھا۔ آپ مغربی چمپارن کے رہنے والے تھے آپ ۱۹۰۲ئ میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۷۵ئ میں خدا کو پیارے ہو گئے تھے۔ آپ نے ملک کی آزادی کے لئے کانگریس میں کام کیا تھا۔ آپ بچپن سے ہی آزاد خیال کے آدمی تھے۔ آپ نے ۱۹۳۰ئ میں نمک ستیہ گرہ کیا تھا اور ان پر ۲۰ روپیہ کا جرمانہ کیا گیا تھا۔ جرمانہ وصول ہو جانے پر رہا کر دیا گیا۔ آپ تاحیات کانگریس میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۷ئ میں کانگریس نے آپ کو چمپارن ضلع ... کا ... بنا دیا تھا۔

جناب شرف الدین احمد قادری انصاری

جناب شرف الدین احمد انصاری کے والد کا نام محمد کریم تھا۔ آپ ۲ر جنوری ۱۹۲۴ء کو مغربی چمپارن کے بیتیا گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی تک کی تعلیم حاصل کی اور وکالت کی۔ آپ نے کانگریس سے ہمیشہ اپنا رابطہ بنائے رکھا اور ملک کی آزادی کی جد و جہد میں حصّہ لیتے رہے انگریز سرکار آپ کو گرفتار کرنے میں ناکامیاب رہی۔

حافظ تبارک حسین انصاری

حافظ تبارک حسین انصاری موضع نرکٹیا ضلع چمپارن کے رہنے والے تھے آپ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے تھے اور آپ کی وفات ۲۷ ر اپریل ۱۹۸۶ء میں ہوئی۔ آپ حافظِ قرآن تھے۔ آپ اعلیٰ درجہ کے مقرر تھے۔ آپ نے نیلے گوروں کی چمپارن میں زوردار مخالفت کی اور جب گاندھی جی چمپارن گئے تو انکو مدد پہونچائی۔ ۱۹۳۰ء کے "نمک ستیہ گرہ" میں بھی آپنے کام کیا تھا۔ ۱۹۴۲ء کے "بھارت چھوڑو آندولن" کے وقت آپ نے کھل کر کام کیا۔ وارنٹ نکلا مگر یہ گرفتار نہ کئے جا سکے۔ ایک سال تک فرار رہے۔ یہ زبردست مجاہد آزادی تھے۔

حسین میاں انصاری صاحب

یہ موضع شکارپور ضلع مغربی چمپارن کے رہنے والے تھے۔ انکو کانگریس تحریک اور ملک کی آزادی سے والہانہ محبت تھی۔ ۱۹۴۲ء کے "بھارت چھوڑو تحریک" میں بھی حصّہ لیا تھا۔ گرفتار ہو کر موتیاہاری جیل میں بند کئے گئے۔ بیتیا کے ڈپٹی مجسٹریٹ نے انکو چار مہینے کی سزا دی تھی۔

عبدالغنی انصاری صاحب

جناب عبدالغنی انصاری کے والد کا نام محمد میاں تھا۔ آپ بتیا ضلع چمپارن کے رہنے والے تھے۔ یہ کانگریس کے ایک جوشیلے کارکن تھے سنہ ۱۹۳۰ء کے نمک ستیہ گرہ میں آپ کو چھ مہینے کی سزا ہوئی تھی۔ آپ سنہ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے تھے اور آپ کی وفات سنہ ۱۹۷۰ء میں ہوئی تاحیات کانگریس سے منسلک رہے۔

علاقت میاں انصاری صاحب

ان کے والد کا نام سمتی میاں تھا۔ یہ ایک غریب آزاد آدمی تھے مگر دل میں حب الوطنی کا جذبہ رکھتے تھے۔ نمک ستیہ گرہ میں آپکو گرفتار کیا گیا تھا۔ اور انھیں چار مہینے کی سزا دی گئی تھی۔ انھیں آرہ جیل میں رکھا گیا تھا۔ جیل میں بیمار پڑجانے کیوجہ سے رہا کر دیا گیا تھا۔ ۵۱ سال کی عمر پائی تھی۔

ولی محمد انصاری صاحب

یہ ضلع چمپارن کے موضع اسوا مجھار کے باشندے تھے۔ انکے والد کا نام ٹھک میاں تھا۔ یہ ملک کی آزادی کے دلدادہ تھے۔ یہ کانگریس کے ہر پروگرام میں شریک ہوتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء کے نمک ستیہ گرہ میں انھوں نے سگولی کانگریس آشرم کے ایک ستیہ گرہی کی حیثیت سے حصہ لیا تھا اور انکو چھ مہینے کی جیل ہوئی تھی۔ انکو پٹنہ کیمپ جیل میں رکھا گیا تھا۔ انہوں نے کل ۵۲ سال کی عمر پائی تھی۔

محمد حسین انصاری صاحب

محمد حسین انصاری ولد عبد الجلیل ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ بیتیا مادن ضلع پچھمی چمپارن کے رہنے والے تھے۔ غریب تھے اور ۶۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ یہ کانگریس کے کارکن تھے اور کھادی کے کپڑے زیب تن کرتے تھے۔ انھیں لوگ بیتیا کا ندھی کہتے تھے ۱۹۳۰ء میں نمک ستیہ گرہ میں حصہ لیا اور گرفتار ہوئے۔ کل ۱۰ روپیہ جرمانہ کی سزا دی گئی۔ جرمانہ ادا کر دینے کے بعد آپکو رہا کر دیا گیا

قدوس میاں انصاری

قدوس میاں انصاری کے والد کا نام نبی میاں انصاری تھا۔ آپ پچھمی چمپارن کے رہنے والے تھے۔ آپ کانگریسی تھے اور ملک کی آزادی کے لئے دل سے کوشاں تھے۔ غریب تھے مگر آزادی کا جذبہ رکھتے تھے اور ۱۹۴۲ء کے بھارت چھوڑو آندولن میں آپ نے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا۔ اور خود کو گرفتار کرایا۔ ۱۸ مارچ ۱۹۴۲ء کو اسپیشل مجسٹریٹ موتی ہاری (بہار) نے آپکو تین سال کی قید کی سزا سنائی۔ بھاگلپور جیل میں قید کیے گئے۔ جیل کی سزا پوری کرنے کے بعد گھر آکر بھی یہ وطن کی آزادی کا کام برابر تندہی سے کرتے رہے۔ سچے خادم وطن تھے۔

حکیم میاں انصاری صاحب

انکے والد کا نام کھیدو میاں تھا۔ یہ موضع میناٹانڑ ضلع مغربی چمپارن کے رہنے والے پرانے کانگریسی تھے۔ ۱۹۴۲ء میں۔ انقلابی کام کرنے کی وجہ سے گرفتار ہوئے۔ انھیں بیتیا کے مجسٹریٹ نے ایک سال کی سزا دی تھی۔ انھیں مجاہد آزادی، ہونے کی پنشن ملتی ہے۔

مجاہدِ آزادی

حکیم اجمل خان

مسیح الملک حکیم اجمل خان ۱۱ فروری ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کا خاندان صدیوں تک مغلیہ سلطنت سے وابستہ رہا۔ ان کا ذہن انقلابی تھا۔ آزادی کے دلدادہ تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔ ہندو اور مسلمان ملک کی ایک قوم تصور کرتے تھے۔ وہ گائے کی قربانی کے خلاف تھے کیونکہ اس سے انکے ہندو بھائیوں کی دل شکنی ہوتی تھی۔ وہ پردہ کے بھی حامی نہیں تھے۔ وہ ماہر طبقیات بھی تھے اور اُن کے ہاتھوں میں شفا کی اوصاف خداداد تھی۔ اس لئے وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے اور مشہور حکیم تھے۔ کانگریس میں انکی بہت بڑی عزت تھی۔ وہ پکے وطن پرست تھے۔ ۱۹۲۱ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ انکو دو کاموں سے خاص لگاؤ تھا۔ ایک ہندو مسلم اتحاد اور دوسرا انکا طبیہ کالج جسکے ذریعہ وہ یونانی اور ایورویدک دواؤں کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں جبکہ ہر چیز بہت سستی تھی دہلی سے باہر جانے کی فیس ایک ہزار روپے ہوتی تھی جبکہ غریبوں کا وہ مفت علاج کرتے تھے۔ قوم نے انکو مسیح الملک کا خطاب عطا کیا تھا۔

مجاہدِ جنگ آزادی

جناب آصف علی

جناب آصف علی ۱۸۸۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ ہندوستان کے علاوہ لندن میں بھی تعلیم پائی تھی۔ بیرسٹر تھے۔ وہ پکے

وطن پرست تھے ہندوستان کی آزادی کے لئے آپ نے بہت کام کیا۔ آزادی کی تحریکوں میں برابر حصہ لیتے رہے اور جیل جاتے رہے۔ ۲۰ برسوں تک دہلی میونسپل بورڈ کے ممبر رہے۔ آپکے نام سے دہلی میں آصف علی روڈ ہے۔ ۱۹۲۸ء میں آپ نے الٰہ آباد میں مس ارونا گنگولی کے ساتھ شادی کی جو جناب آصف علی سے بھی زیادہ مشہور ہوئیں اور انہوں نے ۱۹۴۲ء میں "بھارت چھوڑو" کانگریس کی تحریک میں عملی حصہ لیا اور تحریک کی رہنمائی کی جناب آصف علی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ وہ دہلی کے ایم۔ ایل۔ اے۔ تھے۔ بھارت چھوڑو تحریک" میں حصہ لینے کی وجہ سے ۱۹۴۳ء تک جیل میں رہے۔ اس تحریک کے بعد ان میں اور ارونا گنگولی میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ کانگریس کے عبوری دور میں مرکزی وزیر رہے اور ۱۹۴۷ء میں امریکہ ہندوستانی سفیر کی حیثیت سے تشریف لے گئے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۳ء تک اڑیسہ کے گورنر رہے سوئٹزرلینڈ میں بھی ہندوستان سفیر رہے۔ اپریل ۱۹۵۵ء میں محب وطن آصف علی کا انتقال ہو گیا۔

مجاہدِ جنگِ آزادی

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۲۵ دسمبر ۱۸۸۰ء کو ضلع غازی پور کے یوسف پور گاؤں میں ایک قاضی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں ہوئی۔ بنارس سے مڈل اور الٰہ آباد سے ایف ایس سی پاس کیا۔ حیدرآباد عثمانیہ کالج میں بھی تعلیم حاصل کی۔ لندن سے ڈاکٹری کی ڈگریاں حاصل کیں۔ لندن میں ایک اسپتال میں ریذیڈنٹ افسر تک بنے بہت قابل انسان تھے ۱۹۱۵ء میں ڈاکٹر انصاری ہندوستان واپس لوٹے۔ دہلی میں ڈاکٹری کی، بڑے مشہور

ہوئے۔ وہ سچے وطن پرست تھے۔ اور وطن کی آزادی چاہتے تھے ۱۹۲۷ء میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بنے۔ وہ مسلم لیگ کے بھی پہلے صدر رہے تھے مگر اُسے انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ گاندھی جی کے ساتھ کام کیا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ سول نافرمانی کی تحریک ۱۹۲۲ء میں عملی حصہ لیا۔ اور ترکِ موالات میں بھی حصہ لیا۔ وہ دو بار جیل گئے۔ ۱۵ مئی ۱۹۳۶ء کے دن جبکہ وہ دہرہ دون ایکسپریس سے سفر کر رہے تھے دوران سفر انکو دل کا دورہ پڑا اور انکی وفات ہوگئی۔

مجاہدِ جنگِ آزادی

ڈاکٹر سید محمود

ڈاکٹر سید محمود ۱۸۸۹ء میں ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے علیگڈھ۔ لندن اور جرمنی میں تعلیم حاصل کی۔ وہ پی۔ ایچ۔ ڈی تھے اور بیرسٹر بھی تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک خلافت اور کانگریس بطور سیکریٹری کے کام کیا، بعد کو کانگریس کے جنرل سیکریٹری بنے ۱۹۳۷ء میں جب بہار میں کانگریس کی حکومت بنی تو آپکو وزیر تعلیم بنایا گیا۔ دوسری عالمی جنگ کے موقع پر کانگریسی حکومتوں نے وزارتیں چھوڑ دی تھی اور بعد کو جب بہار میں پھر وزارت بنی تو اسمیں بھی آپ وزیر رہے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۶ء تک وہ مرکز میں بھی وزیر رہے۔ ۱۹۴۲ء کی بھارت چھوڑو تحریک میں شامل ہوئے اور جیل گئے۔ یوں تو وہ کئی بار جیل گئے تھے۔

۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر سید محمود نے مجلس مشاورت قائم کی۔ خلافت رسالہ کے وہ مدیر اعلیٰ تھے۔ اپنی آخری عمر میں وہ اپنے وطن چھپرا (بہار) میں رہے اور وہی انھوں نے انتقال فرمایا۔

مشہور مجاہد جنگ آزادی

جناب فخرالدین علی احمد

جناب فخرالدین علی احمد ۱۳ مئی ۱۹۰۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے
تھے۔ انکے والد جناب ذوالنور علی احمد فوج میں کرنل تھے۔ انکی ابتدائی
تعلیم گونڈا اور دہلی میں ہوئی اور مزید تعلیم انگلینڈ میں حاصل کی۔
اور بیرسٹر بنے، کلکتہ میں کچھ دن وکالت کی۔ حکیم اجمل خان کی حب الوطنی
سے متاثر ہوئے اور سیاست سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ کانگریس میں
شامل ہو گئے۔ آسام کی پہلی وزارت ۱۹۳۸ء میں وزیر بنے۔ ۱۹۴۶ء
میں وہ آسام کے ایڈوکیٹ جنرل بنے۔ آسام کی دوسری وزارت
میں بھی وزیر بنے۔ ۱۹۶۶ء میں مرکز میں وزیر آبپاشی بنے۔ انکا
شمار کانگریس کے لیڈروں میں ہوتا تھا۔ وہ سفیر بھی رہے تھے
جنگ آزادی میں حصہ لینے کیوجہ سے وہ کئی بار جیل گئے تھے۔
سیکولرزم کا سبق انھوں نے جناب رفیع احمد قدوائی سے سیکھا تھا
جو ہندو مسلم اتحاد کے پیکر تھے۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے شادی کی۔
انکی بیگم عابدہ افسانہ نگار تھیں۔ مرزا غالب کے بھانجے عارف
کی پوتی فخرالدین کی والدہ تھیں۔ حمیدہ سلطانہ انکی بہن تھی۔ وہ
ہندوستان جمہوریہ کے پانچویں صدر تھے۔ لکھنؤ میں اُن کے نام
سے "فخرالدین علی احمد" نام کا ایک تعلیمی ادارہ ہے

مجاہد جنگ آزادی

عطاء اللہ شاہ بخاری لاجواب خطیب

جناب عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔

انکے آبا داجداد بخارا سے آکر سری نگر کشمیر میں بس گئے تھے۔ بچپن ہی میں والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ والد گجرات چلے گئے۔ نانا اور نانی نے شاہ صاحب کی پرورش کی، نانا علم دوست انسان تھے۔ انھیں کی صحبت میں شاہ صاحب کو ادبی ذوق پیدا ہوا۔ نانی کے انتقال کے بعد گھر چھوڑ دیا۔ امرتسر میں قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کی دوران ملازمت بھی تعلیم کا شغل جاری رہتا۔ بنارس میں کچھ دنوں تک چاندی کے ورق کوٹ کر اپنا پیٹ بھرا تھا۔ جب تحریک خلافت چلی تو اسمیں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد تو باقاعدہ سیاست میں آگئے۔ اور وہ کئی بار جیل گئے۔ ۱۹۳۱ء میں جماعت احرار کے بھی رکن رہے۔ میدانِ سیاست میں اپنی مثالی خطابت کے لئے مشہور ہوئے (راقم کتاب نے بھی جناب عطاء اللہ شاہ بخاری کی جوشیلی اور مثالی تقریر کانپور کے شردھانند پارک میں کانگریس کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے سنی تھی۔ وہ وہاں آٹھ گھنٹہ تک دھواں دھار بولے تھے۔ ویسی تقریر پھر نہیں سنی) ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ریکارڈ بج رہا ہو۔ شاہ صاحب ۱۹۶۱ء میں راہئ ملکِ عدم ہوئے اور چھوڑ گئے لوگوں کے دلوں پر اپنی مثالی خطابت کا دائمی اثر۔ انکا کہنا تھا کہ "اگر قرآن شریف سے اگر عشق ہے تو انگریزوں سے نفرت ہے۔ انگریز کو بھگانے کے لئے وہ سوروں سے بھی دوستی کر سکتے تھے۔"

مجاہدِ جنگِ آزادی

عبدالرحمٰن

بمبئی میں رہنے والے مجاہدِ جنگ آزادی عبدالرحمٰن، جن کا چند سال پہلے انتقال ہو چکا ہے افسوس کہ ان کے حالات ہم کو بروقت نہ مل سکے لہٰذا شامل نہیں کئے جا سکے۔

مشہور مجاہدینِ جنگِ آزادی

مولانا محمد باقر دہلوی

کہتے ہیں کہ سب سے پہلے جو اُردو اخبار ۱۸۵۷ء میں شائع ہو رہا تھا وہ اُردو کا "دہلی اُردو اخبار" تھا۔ اس اخبار کے مدیرِ اعلیٰ جناب مولانا باقر صاحب تھے۔ جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے غدر یا اپنی جنگِ آزادی کی پہلی لڑائی کو دیکھا ہی نہیں تھا بلکہ اسمیں حصہ بھی لیا تھا وہ اپنے اخبار میں صرف دہلی کی خبریں ہی شائع نہیں کرتے تھے بلکہ انگریزی حکومت کے مظالم پر بھی روشنی ڈالتے تھے اور جنکو پڑھ کر عوام میں حکومت کے خلاف نفرت پیدا ہوتی تھی اور لوگ جنگِ آزادی کے لئے آمادہ ہوتے تھے۔

مولانا باقر صاحب نے اردو اور فارسی کا مشترکہ اخبار بھی "جام جہاں نما" کے نام سے جاری کیا تھا اور "دہلی اردو اخبار" ۱۸۳۶ء میں جاری ہوا تھا۔ مولانا ایک اعلیٰ قسم کے صحافی تھے اور وطن کی آزادی کے لئے آپ اتفاق اور اتحاد کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ آپ کے والد کا نام محمد اکبر تھا۔ آپکے آبا و اجداد ایران کے رہنے والے تھے۔ مولانا باقر کے بزرگ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں ہندوستان میں آکر بسے تھے۔ پہلے کاشمیر میں اور بعد ازاں دہلی میں سکونت اختیار کی تھی۔ آپ نے دہلی کے نامور عالم میاں عبدالرزاق سے تعلیم حاصل کی تھی۔ بعد کو دہلی کالج میں بھی تعلیم پاتے رہے تھے دہلی کالج میں ہی آپ پروفیسر کے عہدہ پر فائز ہو گئے تھے۔ لیکن آٹھ سال کے بعد ہی آپ نے نوکری چھوڑ دی اور ۱۸۳۷ء میں آپنے اپنا لیتھو پریس کھول لیا۔ اور آزادی کی چنگاریوں کو شعلوں میں بدلنے کا کام کرنے لگے۔ دہلی کے علماء نے جب فرنگی سامراج کے خلاف فتویٰ دیا تو

اُسے آپ نے جلی حروف میں پہلے صفحہ پر شائع کیا اور اپنے خصوصی اداریہ میں مسلمانوں سے جنگ میں حصہ لینے کی پُر زور اپیل کی۔ انگریزوں نے مولانا کو باغی قرار دیا۔ کیونکہ انکے مضامین پڑھ کر عوام میں آزادی کا جذبہ شعلہ زن ہوتا تھا۔ انھیں دنوں دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کا قتل ہوگیا۔ وہ طلباء کو عیسائیت کا سبق پڑھایا کرتا تھا۔ قتل کا الزام مولانا پر عاید کیا گیا اور انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ مگر مولانا قاتل نہیں تھے۔ انھوں نے تو اسکو از راہِ انسانیت پناہ دی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ باغیوں نے جب دہلی کالج پر حملہ کر دیا تو مسٹر ٹیلر صاحب بھاگ کر مولانا کے گھر ہی آچھپے تھے۔ مگر جب باغیوں کو پتہ چل گیا کہ وہ مولانا کے مکان میں چھپا ہے تو اس خیال سے کہ باغیوں کا عتاب اُن پر نازل نہ ہو اُنھوں نے اُسے ہندوستانی کپڑے پہنا کر اپنے گھر سے بھگا دیا۔ مگر موت تو اسکے عقب میں تھی۔ باغیوں نے اُسے پہچان لیا اور قتل کر دیا۔ سرکار نے اسمیں بھی مولانا کی ہی سازش دیکھی لہٰذا انھیں گرفتار کرکے گولی سے اُڑوا دیا گیا۔ مولانا باقر نے ۱۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہادت پائی تھی

؎ خدا رحمت کنند بر ایں عاشقِ پاک طینت را

مومن برادری اور کانگریس

مومن برادری کے لوگ کپڑا بننے کا کام کرتے ہیں۔ گاندھی جی نے جب اپنی تحریک بدیشی کپڑوں کے بائیکاٹ کی چلائی تبھی سے اس جماعت کے لوگ کانگریس کے ساتھ ہوگئے اور آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے لگے۔ اس قوم کے ہزاروں لوگوں نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور اپنی قربانیاں دی ہیں گولیاں بھی کھائی ہیں اور پھانسی کے تختہ پر بھی چڑھے ہیں۔ اس جماعت کے لوگوں نے ملک کی تقسیم کو کبھی قبول نہیں کیا اور ملک کی تقسیم کرنے والی مسلم

لیگ کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ اِس لیئے اگر مومن انصار کے کارناموں اور تنظیم کا نگریس کے ساتھ مل کر قربانی دینے کے کارناموں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ملک کی آزادی کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ ہمیں تو سبھی مسلمان مجاہدین کا اپنی کتاب میں ذکر کرنا ہے۔ اِس لیئے جہاں تک معلومات ہو سکی وہاں تک مختصر ذکر کر دیا گیا ہے۔ پھر بھی کچھ نام چھوٹ سکتے ہیں۔ اسکے لیئے قارئین معاف فرمائیں گے۔

گمنام مجاہدین آزادی

فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹ نے اپنی کتاب "ہندوستان میں اکتالیس سال" میں یہ دلِ سوز بیان درج کیا ہے کہ ستائیس ہزار باغی مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کے غدر میں پھانسی دی گئی تھی۔ اور قتل عام میں جو مسلمان مارے گئے اُن کا کوئی شمار نہیں۔ صحیح یا غلط انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کو "جنگِ آزادی" تسلیم کرنے کے بجائے اُسے "اسلامی بغاوت" کہا ہے۔ مگر یہ سچ نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو ہندو کیوں لڑتے اور کیوں پھانسی چڑھتے۔ انگریزوں نے تو ہمیشہ ہی ایسی باتیں لکھی ہیں تاکہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک نہ ہو سکیں۔ یہ ہماری پہلی جنگ آزادی تھی جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے شامل ہو کر اپنا خون بہایا تھا، قربانیاں دی تھی تاکہ انکا وطن کی غلامی کے طوق کو اپنے گلے سے اتار پھینکے۔

مسلم مجاہدین کی صحیح تعداد تو کہیں سے بھی معلوم نہیں کی جا سکتی۔ وہ بھی تو مجاہدِ جنگ آزادی ہیں جو لڑائیوں میں شہید ہو گئے اور گمنام ہیں۔ انکی تعداد تو ان سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے جنکے نام ہم جانتے ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق ۱۸۵۷ء میں پانچ لاکھ مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئی تھی۔ چالیس لاکھ خدائی خدمتگار جنگ آزادی میں حصہ لیئے تھے اور تین ہزار شہید ہو گئے تھے۔

(ختم شد)